حقانی القاسمی
بدن کی جمالیات

حقانی القاسمی

بدن کی جمالیات

(مضامین)

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

○

ایک صفحہ

آواں گارد مجلّہ

'استعارہ'

کے نام

جس میں "بدن کی جمالیات"

محبوب اور معتوب ہوئی۔

○○

بدن کی جمالیات

(مضامین)

حقانی القاسمی

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

104/B ۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ۔۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : **بدن کی جمالیات**

مصنف : حقانی القاسمی

پتہ : C/o. Mr. Abid Anwar, D-64, Flat No.-10,
Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 110025
M:09873747593, Email: h_qasmi@rediffmail.com
hqasmi 2010@gmail.com

تعداد : ۴۰۰

ناشر : انیس امروہوی
○ **تخلیق کار پبلشرز**
104/B ۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود التمش
کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۲
مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- کتابی دُنیا، ترکمان گیٹ، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔ پی)
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶
- رائی بک ڈپو، ۳۴۷ ۔ اولڈ کٹرہ، الہ آباد ۔ ۲۱۱۰۰۲ (یو۔ پی)
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)

T.P.: 0202 ISBN-978-80182-17-9
BADAN KI JAMALIYAAT *(Articles)* 2010
By HAQQANI AL-QASMI Rs. 180.00
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B - YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092
Ph.:011-22442572, 9811612373 E-mail:qissey@rediffmail.com

○

اُس کے لیے

'جو'

سب سے خوبصورت ہے

○○

مرد کی زندگی

عورت کے بدن

سے

شروع ہوتی ہے

(یب یم)

[ایک تبتی مفکر کا قول]

فہرس

OO

بدن کی بوطیقا

میں نے سوچا تھا—!

'سوچ وصال' سے نئی راہیں کھلتی ہیں، مگر سوچ سفر درمیان میں ہی ساقط ہوگیا کہ ماضی کے ان لمحوں کی واپسی اب ممکن ہی نہیں، جن میں رومانیت تھی، خواب تھے، جنون تھا، جذبہ تھا—

(وہ جنون شاید ہی نصیب ہو کہ وہ لمحے خاص ہوتے ہیں
جب ایسی تحریریں وجود میں آتی ہیں، پدمنی پہر میں لکھی
ہوئی تحریریں— اب شاید ہی اس کا ایک حرف لکھ پاؤں،
سکر و سرشاری کی اب وہ کیفیتیں کہاں۔ خاص طور پر جب
ماحول میں مفعولیت ہو تو ذہن کا سارا تحرک منجمد ہو جاتا ہے،
مائنڈ کی میکانزم بدل جاتی ہے۔)

جس ماحول میں آہنگ اور نغمگی نہ ہو تو وہاں ایسی تخلیق وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔ نہ ٹیگور کا نغمہ، نہ چغتائی کی تصویر۔ بدن کی جمالیات صرف اور صرف آہنگ اور نغمگی کی کیفیت میں ہی لکھی جا سکتی ہے، المیہ یہ ہوا کہ حالات نے یہ ساری کیفیتیں سلب کر لی ہیں۔ اب نشاطِ شب مہتاب ہے، اور نہ کوئی نزہت و ناز کا پیکرِ شاداب حسیں۔

بدن بھی آہنگ و نغمگی سے عبارت ہے۔ انسانی آنکھیں اسی آہنگ کی جستجو میں بدن کے اسالیب تک پہنچتی ہیں۔ بدن کا اسلوب ہی قلب و نظر کو نئی جمالیاتی کیفیات

سے آگاہ کرتا ہے اور ایک نئی کنواری کائنات سے روشناس بھی کراتا ہے۔

بدن جس اسلوب کا نام ہے اس کی تفہیم ہر کسی کا مقدور نہیں، یہ مکمل طور پر Abstract ہے، بدن کی سمبالزم اس کے جمالیاتی زاویے اور مرموزی خطوط ہر ایک پر منکشف نہیں ہو سکتے۔ اس کے رمز و کنایات تو فراقؔ جیسے خلاق ذہن پر ہی روشن ہو سکتے ہیں، جس نے منیچر کی سب سے خوبصورت علامت کے اسرار کا یوں انکشاف کیا......

عالم عالم جمال تیرا
دُنیا دُنیا ترا بدن ہے
کیا کیا آتا ہے میرے جی میں
کیسا کیسا تیرا بدن ہے
صحرا صحرا مری محبت
دریا دریا ترا بدن ہے
جیسے پردے میں راگنی ہو
یوں زیرِ قبا ترا بدن ہے
میں نیند میں ہوں کہ جاگتا ہوں
اک خواب ہے یا تیرا بدن ہے
اُڈا ہوا سیلِ رنگ و نکہت
کیا موج نما ترا بدن ہے
چھائی کیفیتوں کی مانند
گھنگھور گھٹا ترا بدن ہے
جیسے کوندا لپکنے کے قبل
ٹھہرا ٹھہرا ترا بدن ہے
جیسے یوں خواب گیت بن جائے
شاعر کی نوا ترا بدن ہے

عالم کا جمال قدِ آدم
آئینہ نما ترا بدن ہے
مانند نسیم صبح گاہی
سیدھا ٹیڑھا ترا بدن ہے
گم سم ہے فراقؔ محو دیدار
حیرت کی سرا ترا بدن ہے

......اور اسی فراقؔ نے سوندریہ کی سب سے تہہ دار علامت عورت کو جمال کائنات کا نقش بتایا اور جمالیات کا رشتہ جنس سے جوڑا......

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی ہے
کتنے ہی شب وصال ہر صبح کچھ اور
دوشیزگی جمال بڑھ جاتی ہے

......اور یہ سچ ہے کہ مرد کی روح، عورت کے جسم کو تازگی بخشتی ہے، اور یہ شادابی مرد کی روح (Semen) میں قید ہے۔ سرخ بیج (عورت) اور سفید بیج (مرد) کے وصال سے ہی کائنات میں کیف ہے۔

کتنے ہی سہاگ راتیں دیکھیں جوالے
بڑھ جاتا ہے روپ کا کنوارا پن اور

فراقؔ نے بدن کی گنگناتی ہوئی لے کو محسوس کیا ہے، سینے میں پگھلے ہوئے آفتاب، ہونٹوں میں رس، ناف میں کوثر، ران میں خورشید دیکھنے والے فراقؔ کی جمالیاتی حس بیدار ہے......

آنکھوں کے جھکاؤ میں ہے خلوت کی اُمنگ
سینے کے تناؤ میں ہے پکھاوج کی ترنگ
نظریں ہیں کہ رہ رہ کے نہا اُٹھتی ہیں

ہر عضو بدن سے وہ چھلکتا ہوا رس

پیکر ناز کی دمک جیسے

کوئی دھیمے سروں میں گاتا ہے

آ آ کے راگنی کھڑی ہوتی ہے

دیکھے کوئی سجل بدن کا یہ رچاؤ

بدن کی جمالیات، بدن آہنگ کی جستجو کا سفر ہے کہ بدن سے ہی کائنات کے داخلی آہنگ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

تمام نشہ ہستی تمام کیف وجود

وہ ایک لمحہ ترے جسم کے پگھلنے کا

بدن کی استعاراتی کائنات اور نشاطیہ رومان کی تلاش آسان نہیں کہ اس کے لیے قدیم متون اور علمی ذخائر سے گزرنا پڑا ہے۔ ان کے مطالعہ سے ذہن کو نئی جہتیں ملی ہیں، نئی سمتیں روشن ہوئی ہیں۔ شاید ہمارا عہد ان سمتوں سے نا آشنا ہی رہنا چاہتا ہے جب کہ ہمہ وقت نئے جزیروں کی تلاش ہونی چاہیے۔ اسی سے انسانی تخیل کی قوت کا ادراک ہوتا ہے۔ انسانی ذہن صرف چند دائروں، لکیروں، لفظوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے، اس لیے جستجو کا عمل ناگزیر ہے۔ جستجو سے ہی نئے دائرے، انسانی تخیل میں جنم لیتے ہیں اور اس کائناتی نظام کے نئے زاویے روشن ہوتے ہیں۔

آج دنیا کو حقیقت سے زیادہ تخیل کی ضرورت ہے۔ تخیل سے ہی کائنات میں حسن ہے ورنہ تو کائنات نہایت بے کیف اور بے رس ہے۔ تخیل کی رومانیت پر ہی اعمال

وافعال کا انحصار ہے۔ بادۂ گلفام مشک بو کی طلب ہی انسان کو نیکیوں سے جوڑتی ہے، تخیل کا تحیر ختم ہو جائے تو کائنات میں انتشار بڑھ جائے گا۔ یہی کائنات کو مربوط و منظم رکھتا ہے۔ مذاہب کا تقدس تو اسی 'تحیر' سے ہی قائم ہے۔

بدن کی جمالیات کی تشکیل، تخیل سے ہوئی ہے۔ بدن کی ظاہری حقیقت کچھ بھی ہو مگر تخیل میں اس سے بڑھ کر کوئی پر کیف شئے نہیں ہے۔ بدن کائنات کی تمام لہروں کا مجموعہ ہے، کائنات کے تمام فاعلی عناصر بدن میں ہی مضمر ہیں اور کائنات کی سریت و رمزیت بھی اسی میں مخفی ہے۔ بدن کے اسرار منکشف ہوں گے تو کائنات کا طلسم بھی کھلے گا۔ بقول شکیل الرحمٰن...... ''عورت کا وجود ایک کائنات ہے اور بدن نیچر کی سب سے خوبصورت علامت ہے، عجیب پُر اسرار کشش ہے اس میں، اسے کسی طرح سمجھانے کے لیے دنیا کی جانے کتنی علامتوں اور جانے کتنے استعاروں کا سہارا لینا پڑا ہے۔''

بدن کی جمالیاتی ہیئت کا ادراک بھی ضروری ہے کہ یہی جمالیات کا سرچشمہ ہے، اور اسی سے جمالیات کے خطوط کا تعین ہوتا ہے۔ جمالیاتی زاویے اس وقت تک روشن نہیں ہو سکتے جب تک کہ انسان کو بدن کی کلیت کا ادراک و عرفان نہ ہو۔ بدن ہی کائنات کی تخلیق اور تسلسل کا وسیلہ ہے تو پھر اس وسیلے کو کلی تناظر میں سمجھے بغیر کیا کائنات کی تفہیم ممکن ہے۔

○

جمالیات بدن پر شاید یہ پہلی کوشش ہے اور یہ بھی جنون کی رہین منت ہے۔
اس کے تعلق سے بڑی عجیب وغریب باتیں ہوتی رہتی ہیں۔
حقانی اباحیت پسند ہے

وہ مہایونی اور یونی تنتر کے طلسم میں گرفتار ہے
میزوفیلیا کا عادی ہے
'کاماسوترا' کے سرتال میں گم ہے
وہ جنبشوں میں زندگی اور زاویے تلاش کرتا ہے
(ہاں یہ سچ ہے کہ مجھے جنبشوں میں زندگی نظر آتی ہے کہ حیات کی ساری حرکیات اسی میں پنہاں ہیں۔ جب میں نے یہ خبر پڑھی کہ......

Pamela Anderson's Boobs Are Collapsing

تو مجھے زبردست شاک لگا۔ پامیلا اینڈرسن کے پستانوں کے انہدام کی خبر وحشت افزا تھی کہ پستان معدوم ہوگئے تو نسل انسانی کا سلسلہ رک جائے گا۔ Twin Towers کے انہدام سے کائنات معدوم نہیں ہوگی، مگر Twin Assessts کے انہدام سے کائنات کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ پستان کائنات کے تسلسل کا استعارہ ہیں اور قدرت کا بہترین عطیہ بھی۔ 'پستان' سے اچھی Poem نہیں لکھی گئی، جتنی موزونیت، تناسب، آہنگ اس میں ہے، وہ کسی اور میں نہیں۔ Norma Stiz کے فطری اور دُنیا کے سب سے بڑے پستان بھی اسی موزونیت اور ہم آہنگی کی وجہ سے دلکشی کا مرکز ومحور ہیں اور یہ پستان تغزل اور کیف سے معمور ہیں۔)
مجھے یاد ہے اب تک — 'حجابیاں' کہتی تھیں
اوئی اللہ — کتنا گندا مضمون ہے
غلیظ، فحش
ہائے توبہ — ایک بار نہیں کئی بار پڑھا ہے
عریاں ہے بالکل عریاں
مگر اس ''اوئی موئی'' کا جواب دینے کی شہوت کبھی نہیں ہوئی۔ یہ سوچ کر ساقط رہا کہ یہ سچ ہی کہتی ہوں گی لیکن ان میں سے شاید ہی کوئی سچ کا سامنا کرنے کو تیار

ہوگی۔ یہ جرأت رندانہ تو صرف مغربی حسیناؤں کو نصیب ہے کہ وہ اپنی دختری زائل ہونے کا اعتراف بھی برسرعام کرلیتی ہیں۔ محجوب مشرقی معاشرے میں اتنی جرأت کہاں کہ یہ مکمل طور سے 'پردے کے پیچھے' کا معاشرہ ہے۔

یہ ساری باتیں سچ بھی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے کہ اسی دنیا، اسی موسم، اسی ماحول میں، لوگ تو اس طرح کی بھی باتیں کرتے ہیں:

حقانی!
یاد ہے تمہیں
پچھلے پہر کی آہٹوں کے ساتھ گزاری ہوئی وہ راتیں
ان راتوں میں روشن ہوتے بدن
بدن سے پھوٹتی خوشبوئیں
خوشبوؤں سے منور ہوتی صبحیں
اور صبح تک رات کے سیاہ ہونٹوں کو سرخ کرنے کی تمہاری وہ جدوجہد
یہ جدوجہد جاری رکھو کہ یہ ختم ہوگئی تو ساری کائنات سیاہ ہوجائے گی۔
حقانی!
تم تو ہمیشہ ساعت وصال میں رہے
لمحہ ہجر نصیب ہی نہیں ہوا
ساری زندگی
بدن مکالمہ میں گزار دی
اور تمہارے وجود سے تمہارا بدن غائب ہوتا گیا
حقانی!
تم نے کبھی دن کا سورج نہیں دیکھا
تم کبھی رات سے باہر ہی نہیں نکلے
رات کی بانہوں میں ہی تمہاری عمر کٹ گئی

حقانی!
تمہیں یاد ہیں
فرائڈ، جیمز جوائس، ایملی ژولا کی وہ باتیں
پھڑکی نامہ، گ نامہ، بھ نامہ، چپٹی نامہ 'بوستان خیال' کی کافرشہزادیاں اور شوق
میں شدت پسندی

وہ بدن، وہ احساس
وہ کیفیت، وہ گداز
وہ نشاط، وہ خواب
بدن سے جڑے ہوئے سارے سپنے
اور سپنے میں لین ہوتا تمہارا وجود
کیا بھول گئے حقانی!
بدن کے صفحوں پر لکھی وہ رومانی عبارتیں
جو 'ماہ تمام' بن گئیں
بادہ ارغوانی بدن پر تمہاری عبارتیں نقش ہیں
تم نے ہر 'عبارت' کو اپنی اشارت سے حسن بخشا ہے
لوح بدن پر لکھے حرف روشن ہو رہے ہیں۔
اس روشنی کو بچائے رکھنا
کہ اندھیروں سے یدھ میں یہ کام آئے گی
کہ دور دور تک اندھیرا ہے
اور تم اندھیرے سے جنگ سے مصروف ہو
بدن جمال کی روشنی میں تمہارا یہ سفر تمام ہو
کہ کائنات سے روشنی ختم ہوتی جا رہی ہے
حقانی!

ہم نے دیکھی ہیں
تمہارے دل کے برنداون
میں رقص کرتی جوان گوپیکائیں
ان کے انمول بدن
ان کی جنبشیں جن میں زندگی ہے
اور جسم کی خوشبو میں بسے ہوئے تمہارے لفظ
تمہاری تحریر میں ایک جاں گداز نشہ ہے
اور آباد ہے Amora میوزیم کا سارا طلسم خانۂ تحیر

○

یہ کتاب میں نے اس لیے بھی لکھی ہے کہ مجھے ملامتوں کے درمیان رہنے کی عادت سی ہوگئی ہے اور جی خوش ہوتا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر۔ دہرے پن یا دوغلے پن کے لیے میری زندگی اور فکر کے فرہنگ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے مطعون و معتوب ہونا منظور ہے کہ یہ بڑے ذہن کا مقدر ہے، مگر منافقت گوارہ نہیں کہ یہ سازشی اور چھوٹے ذہنوں کی بڑی پناہ گاہ ہے اور یہاں تو 'چھوٹے چھوٹے سر' جتنے زیادہ ہیں اس سے کہیں زیادہ سازش اور منافقت ہے۔

یہ سچ ہے کہ میں نیوراتی ہوں، شیزوفرنیا کا شکار، رشتہ ہے جنون سے میرا کہ جنون نہ ہو تو تخلیقیت کی راہیں دشوار ہو جاتی ہیں۔ اس لیے مجھے پھر انتظار ہے پتھروں کا کہ سنگ ہی مداوا ہے اس آشفتہ سری کا۔

اور یوں بھی پتھر ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتا۔ سچ کی راہ میں تو پتھر آتے ہی رہتے

ہیں۔ طارق قمر کا ایک شعر ہے......

سچ بولیں تو گھر میں پتھر آتے رہتے ہیں
جھوٹ کہیں تو خود پتھر بن جاتے ہیں

پتھر بننا منظور نہیں اس لیے پتھر کھانے کی عادت ہی ڈال لی ہے۔ مگر بات پھر وہی......

جن کے گھر شیشے کے ہوتے ہیں، وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے۔

میرا قصور اگر ہے تو صرف اتنا کہ حرف و خیال کے وصال سے اس داخلی کائنات کے مد و جزر اور اسرار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جو خود ایک بدن ہے اور اس تفہیمی عمل میں عقل سے زیادہ حواس سے کام لیا ہے۔

بدن کی جیومیٹری جرم ہے تو اعلانیہ مجرم ہوں اور فرد جرم کے بغیر ہر سزا قبول ہے۔

کیا اس اسٹروجن کی جستجو بھی گناہ ہے جو نسائی بدن کو جمالیاتی پیکر میں ڈھالتا ہے۔

بدن شاعری ہے، تو اس کے لیے عروض بھی ناگزیر ہے۔ بدن کی بحروں کا تعین بھی ضروری ہے تبھی تو زحاف اور زوائد کا پتہ چلے گا۔

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے اس کتاب کے بارے میں، مگر مجھے ان کے کہنے سے کیا لینا دینا، اور ویسے بھی کہنے کا کیا ہے۔ لوگ تو اردو زبان کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ یہ طوائفوں، رنڈیوں اور رقاصاؤں کی زبان ہے۔ پرانے زمانے میں بہت سے اسکولوں میں لڑکیوں کے لیے اردو تعلیم کی مناہی تھی کہ کہیں اس سے لڑکیوں کی اخلاقیات پر منفی اثر نہ پڑے۔ تو پھر میری یہ کتاب بھی جو کہ اردو زبان میں ہے، اگر اردو کی طرح ہے تو میں اس کے بارے میں زبان غیر میں بھی شرح آرزو نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مثنوی سحر البیان سے بھی ہزاروں عورتیں فاحشہ ہو گئیں، ایسا کچھ لوگوں کا گمان ہے اور اب یقین و گمان کا فاصلہ کم ہونے لگا ہے۔

ویسے سعادت حسن منٹو نے مجھے جو خط لکھا ہے کوئی لاکھ اصرار کرے تو بھی میں نہ بتاؤں۔ خواب میں منٹو نے جو لکھا تھا وہ میرے لیے سب سے بڑی سند ہے۔

منٹو کے بعد کسی اور کی ضرورت رہ جاتی ہے کیا؟

یہ کتاب میرے گناہوں میں ایک اور اضافہ ہے، مگر بارگاہ رب الناس میں اس التجا کے ساتھ پیش ہے

مجھ سے میرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ۔

اور یہ بھی کہ اے میرے خدا مجھے ہمیشہ گنہ گار ہی رکھنا کہ نیکی کا غرور زاہد کو شیطان بنا دیتا ہے۔ بار گنہ سے شاید مری فروتنی قائم رہے، اسی لیے یہ آرزو ہے اور یوں بھی اس کائنات ارضی میں ہمارا وجود گناہوں کا ہی رہین منت ہے۔ بقول اسرار الحق مجازؔ......

زندگی کیا ہے گناہ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

'طواف دشت جنوں' کے بعد یہ 'طواف دشت جاں' میری ایک اور تخلیقی آوارگی کا نشان ہے اور......

میری آوارگی بھی اک کرشمہ ہے زمانے میں
ہر اک درویش نے مجھ کو دعائے خیر ہی دی ہے

(جاں نثار اختر)

پھر بھی کتاب پیش کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ بقول جوشؔ ملیح آبادی......

سطح ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

آخر میں یہ دُعا ہے میری رب سے ....

دُعا کے الفاظ شاید مٹ گئے ہیں، جب یہ لفظ طلوع ہوں گے تو خود اپنی تاثیر دکھادیں گے۔ ویسے دُعا کے باب میں اپنا حال کچھ ایسا ہے کہ......

برتی آگ جو باراں کی آرزو کرتے
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

پھر بھی یہی تمنا ہے کہ اس کائنات میں ہر سمت دعا روشن ہو کہ دعاؤں سے ہی طلسمات کے در کھلتے ہیں اور بدن اس کائنات کا سب سے بڑا طلسم ہے۔

OO

۔ حقانی القاسمی

دو ہزار نو کی 15 جولائی (دھرتی سے لمس کا پہلا دن)

بدن اوڈیسی

۱

مجھے یاد نہیں، میں سفر پہ کب نکلا تھا... سفر میں تھا بھی یا نہیں...

ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ گھر کی دہلیز سے قدم باہر رکھا تو بدرِ منیر کے ہونٹوں پہ خاموشی تھی اور شہرزاد کہانیوں کی آغوش میں لیٹی صبح کا انتظار کر رہی تھی۔

گھر سے نکلتے وقت ایک ہاتھ میں کشکول تھا اور دوسرا ہاتھ بالکل خالی۔ رستہ ویران اور میں اکیلا۔ کچھ ہی دور چلا تھا کہ ایک نہر نظر آئی اور اس میں آگ ابل رہی تھی۔ قریب تھا کہ آگ کی لپٹیں میرے بدن کو اپنی بانہوں میں لے لیتیں، میں نے اپنا بدن ٹٹولا۔ میرے بدن سے نہریں جاری ہوگئیں اور ان نہروں میں ڈھیر ساری آگ تھی۔ میری بدن نہریں، آگ سے جل اٹھیں۔ میں ابھی جلنے کی کریا سے گزر رہی رہا تھا کہ اس آگ سے ایک چمن طلوع ہوا، اور اس چمن میں جام بکف پھولوں کو دیکھ کر میری حیرانی بڑھ گئی اور اتنی بڑھی کہ میرا بدن میرے وجود سے غائب ہوگیا...

چند ساعتوں کے بعد جب بدن نمودار ہوا تو سارے درشیہ غائب تھے اور سامنے کنواریوں کے کولہوں کی طرح ریت کے ٹیلے ایستادہ ہوگئے۔ اچانک میری نظر ایک اُجڑے ویرانے پر پڑی۔ اس ویرانے سے ایک شبیہ میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔

"کیا بات ہے انجان مسافر؟" اس کی آواز میں کرختگی نہیں، ملائمت تھی۔

"اتنی رات گئے، اس اجاڑ سنسان میں؟"

"رات...!" میں چونکا۔ 'نہیں، ابھی رات نہیں ہوئی ہے' ابھی تو دن کا تیسرا پہر ہے' میں نے دائیں طرف دیکھا تو آفتاب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی...

"مسافر! تم پاگل اور جنونی لگتے ہو۔" اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"ہاں! میں پاگل اور جنونی ہوں۔ مگر میرے جنون نے ہی مجھے یہاں تک پہنچایا ہے..."

"تمہارا جنون سلامت رہے برخوردار مگر خدا کی قسم ابھی دن نہیں، رات ہے۔"

"میرے جنون نے مجھے دن اور رات کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔ میرا دن، رات سے وصال میں محو ہے اور میری رات، دن سے اختلاط کر رہی ہے۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو، میرے بائیں طرف رات اور دائیں طرف دن ہے... دن اور رات، دونوں میرے ساتھ ہیں۔"

"یہ فلسفہ ولسفہ چھوڑو اور بتاؤ کہ تمہارا قضیہ کیا ہے؟" اس کی آواز اب قربت کا احساس دلا رہی تھی۔

"میرا بدن کھو گیا ہے اور ایک سوتے جاگتے گیانی نے بتایا ہے کہ کئی یگوں سے بدن، جنگلوں اور صحراؤں میں بھٹک رہا ہے۔ اس لیے میں بدن کی تلاش میں نکل پڑا ہوں۔"

"خوش آمدید! مرحبا میرے دوست! ہم دونوں ایک ہی راستے کے مسافر ہیں اور منزل بھی ایک۔ بدن... بدن... بدن..."

یہ جملے وہ ادا کر ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کا صحرا، سمندر میں تبدیل ہو گیا... اور وہ روہانسی آواز میں یہ کہہ رہا ہے۔ "جانتے ہو کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ کون سا دیار ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس کے لب کا چشمہ ابل پڑا۔

"... یہ وہی جگہ ہے جہاں برسوں پہلے میرا بدن کھو گیا تھا۔ بدن بہت خوبصورت بدن۔ اتنا خوبصورت کہ نہ زمین نے دیکھا ہوگا نہ آسمان نے۔"

کیسا تھا وہ بدن۔ کچھ تو بولو... میرے وجود میں تجسس کی آتشیں موج لہریں مارنے لگی۔ اس نے ایک جرعہ کھینچا اور مستی میں لطافت لسانی سے بدن بیانی کے جادو جگانے لگا۔ وہ بدن بیانی میں مست تھا اور اس لولی سرمست کا سراپا پہاڑوں، وادیوں

میں لہرا رہا تھا۔ اس کے بدن کا ترتیہ جادو جگا رہا تھا۔ کتنا خوبصورت نشیلا مد بھرا بدن تھا۔ اس کا۔ اس کا بدن، تخیل کی تختی پر یوں ابھر رہا تھا......

مهفهفة بيضاء غير مفاضة ترائبها مصقولة كاالسجنجل
وجد كجيد الريم ليس بفاحش اذا هى نصته ولا بمعطل
وفرع يزين المتن أسودنا حم اثيث كقنو النخلة المتعشكل
غدائره مستشزرات الى العلا وتضل المدارى فى مثنى ومرسل
وكشح لطيف كاالجديل مخصر ساق كانبوب السقى المذلل

- گوری چٹی اور پتلی کمر والی ہے۔ پیٹ ڈھلکا ہوا نہیں ہے، اور سینہ آئینہ کی طرح چکنا اور شفاف ہے۔
- اور اس کی گردن سفید، ہرنی کی طرح ہے۔ جب وہ گردن اٹھاتی ہے تو اس کی لمبائی نہ بدنما معلوم ہوتی ہے اور نہ ہی سونی دکھائی دیتی ہے۔
- اور گندھی ہوئی چوٹی کے بال اتنے کالے اور گھنیرے ہیں کہ پشت کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور اتنے گھنے ہیں کہ جیسے خوشوں سے لدی ہوئی کھجور کے درخت کا خوشہ ہوں۔
- اوپر کو اس طرح اٹھی ہوئی زلفیں ہیں اس کی کہ گندھے ہوئے بال بٹے ہوئے اور لٹکے ہوئے بالوں میں بوجہ کثرت کے کھوئے سے جاتے ہیں۔
- اور کمر اتنی پتلی اور لچک دار ہے جیسے کہ شتر کی مہار ہو، اور پنڈلی ایسی صاف ستھری کہ جیسے سرسبز و شاداب...

عنیزہ کا جلوہ صد رنگ بدن واقعی بے نظیر ہے، اس کے جمال کا جواب نہیں...

میری جان، یہ بدن، بدن نہیں، یہ تو آتما ہے۔ اس میں پوری کائنات چھپی ہوئی ہے۔ اس بدن میں ہی برزخ ہے اور جنت بھی۔

اس آدمی نے اس اجڑے مکان پہ ایک الوداعی نظر ڈالی اور بصد حسرت و یاس اپنے چتکبرے گھوڑے پر سوار ہو گیا جس کا جسم چھریرا تھا اور کمر ہرن کی طرح پتلی۔ ٹانگیں

شتر مرغ کی طرح، سینہ چوڑا چکلا اور بے حد بھرپور اعضاء، انتہائی تیز رو اور سبک رفتار...

اپنے گھوڑے کی پشت پر اس نے مجھے بھی سوار کیا۔ صارخ، عدیب، قطن، یذل، ستار، کتیفہ، قاذف، قذاران، تیما، ثبیر، مجیمر، صحرائے عبیط سے گزرتے ہوئے وادی جوا میں رکا... یہ ساری وادیاں بارش میں نہا گئی تھیں اور ان وادیوں میں بھیگتے جلتے بدن کی مدھر تان سنائی دے رہی تھی۔ کبھی ام الحویرث کا سراپا اُبھرتا تو کبھی ام الرباب کا اور کہیں دور ام جندب کا دھندلا دھندلا سایہ بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر ٹھہر کر راگ بدن کو اپنی سماعت اور حافظے میں قید کیا اور گھوڑے کی زمام دارہ جلجل کی طرف موڑ دی۔ دارہ جلجل کے آب میں مشک وعنبر کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ڈھیر ساری برہنہ آگ سے ہم آغوشی میں محو تھا۔

الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پھر عنیزہ کا عارض گلگوں لہرانے لگا، اس نے دوستانہ لہجے میں تاکید کی کہ عمرو بن کلثوم سے ضرور مل لینا، وہ بھی ہمارے بدن گھرانہ کا ایک فرد ہے۔ بدن کے غیاب میں بہت سارے عذاب میں مبتلا ہے۔

''مگر آپ کا نام؟''

جب تک اس قد سرو جویبار کا سنگ تھا، میرا نام کائنات کے صفحہ پر الملک الضلیل امرؤ القیس درج تھا اور اب میں بدن کے بغیر بے نام و نشان ہوں۔ اب یہ جبل عسیب ہی میرا مستقل مستقر ہے جہاں ایک مغموم شہزادی شہید عشق ابدی نیند کی بانہوں میں سوئی ہوئی ہے۔

میری اگلی منزل جزیرۂ فرات تھی، سردار مہلہل کی بیٹی اور عمرو بن کلثوم کی ماں 'لیلیٰ' کا گھر— دروازے پہ دستک دی تو ایک چشم خماری نے دروازہ کھولا... میری نگاہ

اس سراپا پہ ٹھہر گئی... عمرو نے میری محویت اور حیرانگی کو توڑتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر اندر کی عمدہ زعفرانی شراب سے لبالب ایک فنجان میرے سامنے رکھ دیا اور میری طرف مخاطب ہوا۔

''کیسے آنا ہوا؟''

''بدن کی شراب اور گیسوئے مشک افشاں مجھے یہاں کھینچ لائی۔''

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔''میں بھی برسوں سے جعد مشکیں کی ہی تلاش میں ہوں...'' عمرو کی آنکھیں مخمور تھیں اور وہ بے خودی کے عالم میں بدن داستانی میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں ایک سروسیم اندام رقص کر رہی تھی اور وہ یہ کہہ رہا تھا......

- اگر تم اس کے پاس خلوت میں جاؤ، جب رقیبوں کا خوف نہ ہو۔ تو وہ تم کو یہ چیزیں دکھائے گی۔
- ایسے دو خوبصورت بازو، جو دراز گردن والی سفید رنگ کی اونٹنی سے مشابہ ہیں۔ وہ اونٹنی جس کے پیٹ میں کبھی بچہ نہ رہا ہو اور اس کے اعضا نرم و نازک ہوں۔
- اور ایسے خوشنما، نرم و نازک پستان جو ابھار اور گولائی میں ہاتھی دانت سے بنے ہوئے ڈبے سے مشابہ ہیں اور چھونے اور مسلنے والوں کے ہاتھوں سے محفوظ۔
- اور وہ تم کو اپنے اونچے اور گداز قد و قامت کی لچک سے محظوظ کرے گی۔ اس کے سرین اتنے بھاری بھر کم ہیں کہ مشکل سے ہی اٹھتے ہیں۔
- اس کے سرین اتنے بھاری ہیں کہ دروازے سے نکلنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے جبکہ کمر بے حد نازک ہے۔
- اور وہ تم کو اپنی خوبصورت پنڈلیاں بھی دکھائے گی جو سنگِ مرمر یا ہاتھی دانت کے ستون معلوم ہوتے ہیں۔

جب وہاں سے لوٹا تو کوہِ خزار پر آگ روشن تھی اور آگے ذی اراط کی وادیاں سنسان اور اس وادی سنسان میں ایک نرگس فتان کا رقص شعلہ بھڑکا رہا تھا۔

ابھی کچھ ہی مسافت طے کی تھی کہ مقامِ شہمد پہ ایک ناقہ سوار پہ نظر پڑی۔ ناقہ بڑے کلے ٹھلے کی تھی، گدرایا ہوا بدن، اس کی رانیں اتنی چکنی اور اتنی بلند کہ جیسے کسی بلند مکان کے دو خوبصورت دروازے ہوں۔ کمان کی طرح خم پسلیاں، لمبی گردن، ملک شام کے بنے ہوئے کاغذ کی طرح چکنے رخسار، یمن کی ادھوری کی طرح نرم کومل ہونٹ اور چال ایسی کہ رقاصہ بھی شرما جائے۔

میں اس ناقہ جمال پہ سوار شخص کو دیکھ کر حیران تھا جو بڑی محویت اور فنائیت کے ساتھ ایک کھنڈر پہ اپنی نگاہیں گاڑے ہوئے جانے کیا کچھ تلاش کر رہا تھا۔ قریب پہنچا تو قدموں کی آہٹ سے وہ چونک پڑا اور اس کے دونوں لوتھڑوں کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ مگر اس نے بڑی ملائمت سے سوال کیا۔

''اتنی تیز دھوپ میں تم کہاں سے؟''

''دھوپ... دن... میں سمجھا نہیں۔'' میں نے اپنی دائیں طرف دیکھا تو پورا علاقہ سیاہ رات کی بانہوں میں تھا۔

''لگتا ہے تمہاری عقل پر صحرا کی ریت پڑ گئی ہے...''

''نہیں، بالکل نہیں۔ میں بقائمی ہوش و حواس پھر کہتا ہوں کہ ابھی دن نہیں، رات ہے اور رات بھی انتہائی بھیانک، خوفناک کہ...

''خیر تمہاری بات مان لیتے ہیں تو بتاؤ پھر اتنی اندھیری رات میں تم یہاں کیوں بھٹک رہے ہو؟''

''آفتاب خوباں کی تلاش میں..''

اس نے ایک سرد آہ بھری اور گویا ہوا۔ ''میں بھی برسوں سے بوسہ برلب قصر بلند کے لیے پریشاں ہوں۔ اپنی محبوبہ خولہ کے نفحات نفس کے لیے بھٹک رہا ہوں۔ اس سیمیں عذار کے بدن کا راگ سنو گے۔

اس کی بدن بیانی بند ہوئی تو مجھے دور کھڑی سورج کی چادر سے اپنا بدن ڈھانپے ایک باکرہ نظر آئی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ثیبہ ہو، پھر بھی اس درۂ ناسفتہ کو دیکھ کر خیال آیا کہ

کہیں خولہ یہی تو نہیں۔

میں اسی سوچ میں گم تھا کہ ایک آواز میرے کانوں میں گونجی۔ یہ ہماری محفل نشاط میں رنگ بھرنے والی مغنیہ ہے، اس کی آواز میں جو بدن ہے، وہ تمہیں لذتوں سے سرشار کردے گا۔ تم آج اس محفل میں مدعو ہو، مجھے امید ہے کہ تم میری دعوت ضرور قبول کرو گے۔ تمہیں بہت مزہ آئے گا، کیونکہ......

''مغنیہ بہت حسین ہے۔ اس کا جسم گداز ہے۔ چاکِ گریباں بہت کشادہ ہے اور نہایت نرم خو ہے۔ یاران محفل کی چھیڑ چھاڑ اور دست درازیوں پر بگڑتی بھی نہیں۔''

''میں کیسے انکار کرسکتا ہوں۔ اس کا بدن تو مجھے ابھی سے بلا رہا ہے۔ ایسے بدن سناٹوں میں بولتے ہیں تو اور بھی اچھا لگتا ہے۔''

''یار! تم تو میرے قبیلے کے آدمی نکلے۔ ہم دونوں کا سلسلۂ طریقت و معرفت بھی ایک ہی ہے۔''

''کیا مطلب!'' میں چونکا۔

''مطلب یہ کہ میں ایک انتہائی معزز اور شریف آدمی ہوں۔ میری زندگی کے صرف تین مقاصد ہیں۔ محبت، مے نوشی، مردانگی کا مظاہرہ... اور تم جانتے ہو کہ بدن اہلِ دل کے لیے نزہت گاہ انس ہے اور اہل خلوت کی شب قدر، روئے گل سے ہی روشن ہوتی ہے۔ بدن کی بلاخیزیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں... اور جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے، بس یہی کہ جب آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوں تو میری بانہوں میں ایک گل اندام مہ رو آجائے جو اتنی حسین اور خوبصورت ہو کہ بارش میں برق دوڑ جائے۔''

- وہ نازک اندام محبوبہ اپنے حسن و دل کشی کو جھانجھ، کنگن اور بازوبند پہن کر اس طرح بڑھائے ہوئے ہو کہ جو اس کے نازک جسم پر ایسے معلوم ہوتے ہوں جیسے ارنڈ اور مدار کے بغیر چھانٹے ہوئے درختوں کو زیور پہنا دئے گئے ہوں۔

پھر میری منزل ایک ویران سی جگہ تھی۔ یہاں نشے میں بدمست ایک شخص ملا جو کفل کو مفرش بنائے محوخواب تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے وہ اٹھا اور مجھے ایک خمار

کے گھر لے گیا۔ شغل الجمر سے اس نے اپنا حلق تر کیا اور پھر وہ اپنی داستان سرائی میں کھو گیا۔ وہ بار بار اس ناہدۃ الثدیین کا ذکر رہا تھا۔ جس کے لجہ بحر میں غوطہ زنی کے بعد اس نے سمندر کی سیر سے توبہ کر لی تھی اور مسافرت علی الظہر کا عزم بالجزم کر لیا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہارون رشید کے اس محل میں بھی گیا جہاں خزران رہتی تھی جس نے اپنی زلفوں سے اپنے بھیگتے جسم کو ڈھک کر ہارون رشید کے آتشِ شوق کو بڑھا دیا تھا اور اپنے جسم کے جمال کے جادو سے ہارون کو اپنی ادا کا اسیر بنا دیا تھا۔ اس کے ''رمان صغار'' اور ''ارداف ثقال'' پہ ہارون کی ہری ہری نظر تھی۔

''حی بطان'' میں مجھے ایک شخص ملا جو اپنے پاؤں کو کندھوں پر لٹکائے ہوئے تھا۔ پاؤں کے نیچے آسمان اور سر پہ زمین اٹھائے آدھے سر، ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کا آدمی ایک خوبصورت گل اندام کو اپنی باہنوں میں سمیٹے اس کی زلف مشکیں سے اپنے نامکمل وجود کو تکمیل کی منزلوں تک پہنچانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ مجھے دور سے 'توباذ' کا وہ پہاڑ بھی نظر آیا جہاں مجنوں لیلیٰ کی محبت پروان چڑھی تھی۔ وہ وادی محبت کے نغموں سے گونجتی ہوئی نظر آئی۔ وہاں محبتوں کے تازہ گلاب کھلے ہوئے تھے اور ہر طرف ایک ہی نغمہ تھا، جمال اور وصال کا، لیلیٰ کے اس آتشیں بدن کا جس نے مجنوں کو راکھ کر دیا تھا۔ میں لیلیٰ کے شوہر ورد بن محمد العقیلی سے بھی ملا اور مجنوں کی خیالی دنیا میں اس کے ساتھ بھی رہا۔ یہیں قیس ولبنیٰ سے بھی ملا۔ قیس نے بتایا کہ کس طرح لبنیٰ کے ہاتھوں کے ٹھنڈے پانی نے اس کو آتش نفس بنا دیا تھا۔ اس ٹھنڈے پانی کی آگ میں پوری زندگی جلتا رہا۔ اس کی سرو قامتی، خوش اندامی، خوش گفتاری کے جبل نے اس کے قلب کو وید دیا تھا۔

وادی الصوین میں گلابی کپڑے پہنے ہوئے ایک انتہائی خوبرو جوان سے بھی ملاقات ہوئی۔ جس کے جلو میں خوبصورت حسینائیں، زبرجد اور یاقوت سے بجی سنوری تماثیل کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس سے مل کر جی بہت خوش ہوا۔ وہ خوش شکل، دراز قد، بنو مخزوم کا بانکا، البیلا، چھیل چھبیلا جوان تھا۔ اس نے ہر خطے کے بدنی جمال کی لذت

کشید کی تھی۔ یہ عمر تھا شاید جو قمر کی طرح حسین عورتوں کی آنکھوں میں ہمیشہ طلوع ہوتا رہتا تھا۔ وہ ایسا بھنورا تھا جس پہ کلیاں نثار تھیں اور یہ کلیاں لہیبِ شوق میں جلتی رہتی تھیں۔ اس کا عورت اور جسم و جمال سے بہت گہرا رشتہ تھا۔ لذتِ نظر میں ہی عمر گزر گئی۔ زمانے کی حسین ترین عورتوں سے عشق ہی اس کی حیات تھی۔ میں نے رملہ کو دیکھا اور سکینہ کو بھی۔ اس نے مجھے لیلۃ ذی دوران کا ایک رومانی قصہ بھی سنایا۔ میں نے اس کی آنکھوں سے ہند کے قد رعنا کو بھی دیکھا جس کے جمال کا جواب نہیں۔ وہ مجھے الصورین کی محفل نشاط میں لے گیا جہاں مغنی اس کی غزلیں گا رہے تھے اور دوشیزائیں مست ہو رہی تھیں۔ عمر مجھے غزل کے جمال کا عروج اور سدرۃ المنتہیٰ لگا۔

مقام حجون جب پہنچا تو بہت سارے لوگ قصص اور مسامرات میں مصروف تھے، میں نے دیکھا کہ جمیل بثینہ، کثیر عزہ، قیس ولبنیٰ ایک دوسرے کے بدن میں کھوئے ہوئے جمال وجلال کی لذت کشید کر رہے ہیں۔ میں ان وادیوں میں حرقہ بنت متجردہ، ریحانہ، رقیہ، رباب، سلمہ، سعادت، سکینہ کو تلاش کر رہا تھا جن کے جمال کا جلوہ کبھی ان وادیوں کو سرشار و شاداب رکھتا تھا۔

ابھی میری بدن یاترا کسی منزل پہ ٹھہری بھی نہیں تھی کہ گھاٹی سے ایک آواز طلوع ہوئی۔ بے حد رسیلی آواز۔

''تم صحرا، میں اور کتنے دنوں تک بھٹکتے رہو گے؟ جاؤ اپنے وطن کو لوٹ جاؤ۔ تمہارے وطن میں تو اتنا بدن ہے کہ ازل سے ابد تک کی یاترا بھی کم پڑ جائے۔''

یہ آواز میرے دل میں اُتر رہی تھی اور ایک ہیولیٰ او پر نمودار ہو رہا تھا۔

''آپ کون؟'' میں نے اضطراب کے عالم میں پوچھا۔

مجھے تم ابن بطوطہ بھی کہہ سکتے ہو، البیرونی بھی اور چاہو تو فاہیان بھی کہ سیاحوں کا کوئی قبیلہ، کوئی نام نہیں ہوتا۔ ہم نے ایک ہی ساتھ تمہارے وطن کی سیاحت کی ہے۔ تمہارے وطن کے ہر ہر چپے پر بدن روشن ہے۔ ہر خطہ، بدن کے ایک ایک

انگ کی طرح سندر ہے۔

یہ سنتے ہی میری آنکھوں میں میرا ملک 'ہند' رقص کرنے لگا اور سبحۃ المرجان کا ایک ورق ہوا میں لہراتا ہوا میرے قلب سے آکر چمٹ گیا... اس پہ کیا لکھا تھا، میں نے اس سے بالکل نہیں پڑھا۔ بس اس ورق کو اپنے ہونٹوں سے لگالیا اور اس کے لفظوں اور اس کے شبدوں کو اپنے قلب میں سمالیا۔

مجھے اس رجعت قہقہری پر سخت ندامت ہورہی تھی۔ مگر رجعت قہقہری ہمارے یہاں کے ذہنوں کا نصیب ہے۔ یہ سوچتا ہوا، ابھی کچھ دور ہی بڑھا تھا کہ کسی نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''ہندوستان کا قصد ترک کردو، ابھی کچھ اور وادیوں اور شہروں کا طواف باقی ہے۔تم نے تو ایک ہی چکر پورا کیا ہے، چھ چکر ابھی اور ہیں۔ سات چکروں کے بعد ہی تمہاری یاترا پوری ہوگی ...؟''

''میرا ہندوستان تو ایسا ہے، جہاں سات چکر تو کیا، سات جنموں کا چکر بھی پورا نہیں ہوسکتا۔''

میں تمہارے سات چکر، سات ثانیہ میں پورا کردوں گا۔ تمہیں پتہ نہیں، تم وہ ہو جو ڈیڑھ قدم میں ساری پرتھوی، ساتوں ساگر لانگھ سکتے ہو... اس نے بہت ہی پُر اعتماد لہجے میں کہا تو میرے شک کا دائرہ طویل ہوتا گیا۔

''کون ہوسکتا ہے یہ شخص؟''میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے میرے ماتھے پر اُگی ہوئی سوچ کی لکیریں پڑھ لیں۔

اب میں ایک وادی سے گزر رہا تھا جہاں کسی بشر، شجر، حجر، کا نام ونشان تک نہ تھا۔ پہلی بار میرے قدم لرزے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے پاؤں تلے زمین اور سر کے اوپر آسمان نہیں۔ قریب تھا کہ خوف کے مارے میری جان نکل جاتی، ایک ہیولی، زمین کا سینہ شق کرکے نمودار ہوا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''لاتخف، لاتخف، تمہیں کوئی بھی اب گزند نہیں پہنچا سکتا۔''

''لیکن میں ہوں کہاں؟ یہ جگہ کون سی ہے؟''

''یہ عبقر کی وادی ہے۔ ہاہاہا... یہاں تمہارا سارا تجسس تمام ہو جائے گا۔''

میں اس کی معیت میں چلنے لگا۔ اچانک میری نظر اس کے سراپے پر پڑی۔ بہت ہی لمبا چوڑا۔ طویل القامت، عظیم الجثہ۔ میں نے اپنی حیات میں دیو ہیکل نہیں دیکھا تھا۔ میری حیرت بڑھ گئی۔ پھر میں نے اس کے بدن پہ نگاہ ڈالی تو لرز گیا۔ اس پر عجیب و غریب اون کا جبہ تھا۔ اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ ''یہ جبہ تو میرے جسم پر سات سو برسوں سے ہے۔ مرورِ ایام کا اس جبے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

اس کی معیت میں کچھ مقام ہی طے کیا تھا کہ غیبی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔

رحلت سمیه غدوة اجمالها

غضبی علیك فما تقو بدا لها

میں آواز پہ چونکتا جاتا تھا اور وہ میری ڈھارس بندھاتا جاتا تھا۔ آگے بڑھتے چلو، اس طرح کی آوازیں تمہارے کانوں سے ٹکراتی رہیں گی...

ایک قدم اور آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک آواز پھر میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

اقول والنجم قد مالت اواخره

الی المغیب تبین حار

اس نے پھر میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا اور ڈھارس بندھائی اور پھر مربیانہ، مشفقانہ انداز میں گویا ہوا۔ ''یہ آوازیں وہ لہریں ہیں جو پوری کائنات میں پھیلتی ہیں۔ دنیائے شعر و ادب کا سارا نظام یہیں سے چلتا ہے۔ یہیں تخیلات کی سرسبز وادیاں ہیں۔ یہ الہام اور القا کی وادی ہے۔''

میں اس شخص کی حیران کن باتیں سن ہی رہا تھا کہ مجھے ساعت حیرانگی میں چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی، وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ چند ثانیہ کے بعد وہ

پھر نمودار ہوا مگر اس بار وہ اکیلا نہیں، پورے ایک قافلے کے ساتھ تھا۔ عجیب الخلقت قافلے کو دیکھ کر تو میرے ہوش وحواس اڑ گئے۔ اس نے میری ڈھارس بندھائی اور کہا کہ یہ شہر نصیبین سے آئے ہیں۔ ہر ایک سے اس نے مجھے متعارف کرایا اور آخر میں ایک شخص کو میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ یہ شخص تمہارے کام کا ہے، تم جو چاہو اس سے پوچھ سکتے ہو۔ اس کا نام خرافہ ہے۔

خرافہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''میں عذری خاندان کا ایک فرد ہوں۔ بہت دنوں تک غیر مرئی مخلوق کی معیت میں رہا ہوں۔ میرے پاس جنی عجائبات کا ایک کشکول ہے، وہ میں تمہاری نذر کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ بار نشاط تم ہی سنبھال سکتے ہو۔''

خرافہ میرے دوش بدوش چل رہا تھا اور عجائبات سے متعجب کرتا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے اچانک ایک کنوئیں کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔

''اس کنوئیں کے اندر جھانکو۔ تمہیں وہ سب کچھ نظر آئے گا، جس کی تلاش میں تم نکلے ہوئے ہو۔''

''مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔''

''آنکھوں کے ساتھ اپنے قلب کو بھی اس میں شامل کر لو۔ سب کچھ نظر آئے گا۔''

میں نے اپنے عین وقلب سمیت کنوئیں کی گہرائی میں جھانکا تو طلسماتی عجائبات دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''نہیں نہیں... یہ کنواں نہیں۔ یہ اور ہی کچھ ہے۔''

''برخوردار! یہ کنواں ہے، کہانیوں کا کنواں... بہت گہرا کنواں، تین سو سیڑھیاں اترنے کے بعد اس کی جگت نظر آتی ہے۔ اسی کنوئیں سے کہانیاں نکلتی ہیں۔ جس دن یہ کنواں خشک ہو جائے گا، دنیا سے ساری کہانیاں ختم ہو جائیں گی......'' اس نے پھر کہا۔
''ایک بار اپنے مکمل ذہنی وجود کے ساتھ اس کنوئیں کے اندر جھانکو۔'' میں نے حکم کی

تعمیل کی۔ میری نگاہ جوں جوں نیچے اتر رہی تھی، کہانیاں اوپر آتی جا رہی تھیں۔ اس دوران میں نے اپنے بدن کو ٹٹولا تو میرا بدن غائب تھا۔ خرافہ بے تحاشہ ہنس رہا تھا اور میں زار و قطار گریہ کر رہا تھا۔ پھر دیکھا کہ ایک لمحے میں میرا بدن واپس آ گیا۔ مگر یہ بدن بہت مختلف تھا۔

"تمہارے بدن میں کہانیوں کے بدن کا منتھن ہو گیا ہے۔ کہانیوں کا کنواں، بدن میں تحلیل ہو گیا ہے۔ تم جہاں بھی رہو گے یہ کنواں تمہارے ساتھ ساتھ ہوگا۔"

اچانک میرے بدن میں جنبش ہوئی اور میرے بدن سے باہر ایک کہانی سکرا رہی تھی۔

خرافہ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "تم جس امر کہانی کی تلاش میں آئے تھے، وہ کہانی تمہیں مل گئی۔ یہی کہانی ساری کہانیوں کا سر چشمہ ہے۔ کئی یگوں تک تم اس کہانی کے ساتھ رہ سکتے ہو۔ یہ کہانی کبھی پرانی نہیں ہو سکتی۔ تم جس رنگ میں ڈھالنا چاہو گے، ڈھل جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے خرافہ غائب ہو گیا اور کہانی امر بیل کی طرح مجھ سے لپٹ گئی اور اٹکھیلیاں کرنے لگی... اس نے میری آنکھ پہ ہاتھ رکھا تو میری آنکھیں غائب ہو گئیں اور اس کی جگہ دل دھڑکنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے میری انگلیوں کو مس کیا تو میری انگلیاں جھرنوں میں تبدیل ہو گئیں اور اس جھرنے کے نیچے امر کہانی نہانے لگی۔ امر کہانی کے جمالیاتی زاویوں کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ اس کے بدن کے ایک حصے سے سورج طلوع ہو رہا تھا تو دوسرے سے چاند۔ میں سورج چاند کے اس ملتقیٰ کو دیکھنے میں محو تھا کہ ایک ہاتف کی آواز آئی۔ کہانی وہی خوبصورت ہوتی ہے جس کے بدن میں سورج اور چاند دونوں ہی طلوع ہوتے ہوں اور وہ بہت سندر ہوتی ہے جو باطن کے صاف شفاف سمندر میں نہاتی ہے...

کہانی میرے ساتھ تھی اور اس کے پیچھے عاشقوں کا ہجوم تھا۔ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو اس کے عاشقوں میں ایک چار سو سالہ معمر شخص بھی تھا جو بڑی حیرت اور حسرت سے اس امر کہانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔ معمر شخص

سے ملا تو اس نے بتایا کہ دنیا بھر کی کتھائیں لکھی ہیں اس نے، جو دوسروں کے نام منسوب ہیں۔ یہ امر کہانی بھی اسی کی تخلیق ہے۔

ایک وادی سے گزرتے ہوئے معمر شخص ایک مقام پر آکر رک گیا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''کیا یہاں تمہیں کچھ نظر آرہا ہے؟'' میں نے نفی میں جواب دیا تو زیرِ لب مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور یوں گویا ہوا۔

''یہ ہے کہانیوں کا قبرستان... ازل سے ابد تک کی ساری کہانیاں یہیں دفن ہیں۔تم سن رہے ہو آوازوں کا شور اور دیکھ رہے ہو وہ دھواں، جو ان قبروں سے نکل رہا ہے۔ یہاں ایک ایک قبر میں کئی کئی لوگ دفن ہیں اور اس آخری قبر کے قریب جو ایک ٹیلہ نظر آرہا ہے، اس میں منکر نکیر کی مہریں لگی کہانیاں ہیں۔تم ان کہانیوں سے ملو گے تو مایوسی بھی ملے گی اور مسرت بھی۔تم نے کہانی کا مبدا و معاد، مہد اور لحد، مایئول اور مآل دیکھ لیا ہے... کنوئیں سے قبر تک کا منظر، آنکھوں میں محفوظ کرلو۔ یہی تمہارے لیے زادِ راہ بھی ہے اور حاصل سفر بھی۔'' اور جاتے جاتے اس نے بڑی سی صندوق تھما دی اور ہدایت کی کہ کسی سوکھے، برہنہ درخت کے نیچے ہی اسے کھولنا... اس کا سلسلۂ کلام جاری تھا کہ ایک ہاتف نے آواز دی کہ تم لوگوں کے پاؤں کے نیچے ایک بڑی کہانی کچل دی گئی ہے۔ وہ کہانی جاگنا چاہتی تھی۔ تم لوگوں نے اسے پھر نیند کی آغوش میں سلا دیا۔ میں ساری کہانیوں کو اجتماعی سلام کرکے مڑا ہی تھا کہ امر کہانی میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ پہلے مسکرائی پھر میرے سینے سے چمٹ گئی... اس وقت وہ بالکل ''زلیخا'' جیسی لگ رہی تھی...

میں نے کچھ دور آگے چل کر صندوق کھولا جس پر قفل ابجد لگا ہوا تھا۔ دیکھا کہ برہنہ سوکھے درخت ہرے بھرے شاخوں کے لباس سے ڈھک گئے ہیں اور اچانک ایک ہرا بھرا پتہ گرا، میں نے اسے اٹھایا تو وہ پتہ لرز رہا تھا، میں نے غور سے دیکھا اس پتے پر ایک کہانی لکھی ہوئی تھی اور میں پڑھ رہا تھا، اس کے حروف یوں

روشن ہو رہے تھے......

''اچانک میر کو اپنا ہاتھ چشمہ نوش تک پہنچتا محسوس ہوا۔ اسے نور السعادۃ کے بدن کے بارے میں کچھ پتا تھا نہیں کہ پہلے کے دیکھے ہوئے خطوط اور نشانات کے سہارے وہ پہچانتا کہ یہ بدن اسی کا ہے یا کسی اور کا۔ جہاں جہاں اس کا ہاتھ پہنچتا وہ جگہ پہلے سے زیادہ نرم اور گرم لگتی تھی۔ دل میں عرصے سے کرید تھی کہ کوہ زہرہ تختۂ عطار کی طرح پھسلواں ہوگا یا وہاں سبزہ لب جو کی کیفیت ہوگی۔ اسے خسرو کی دو رباعیاں یاد آئیں جنہیں دل میں بھی دہرانے کی ہمت اس میں نہ تھی... جہاں اس کا ہاتھ تھا وہ مخملِ دوخوابہ تھا یا... نور السعادۃ (اگر وہ نور خانم نہیں تو پھر کون ہے وہ؟) کا سر تکیے پر تھا، بائیں کلائی اور ہتھیلی کچھ نیند اور کچھ تھکن کے انداز میں اس کے ماتھے پر اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ رخ تھوڑا سا میر کی طرف، لیکن چہرے پر توقع یا لطف آئندہ کی پیش آمد کے تاثر کی جگہ متانت آمیز تناؤ گویا وہ خود نہیں جانتی کہ یہاں کیا ہونے والا ہے، یا شاید جانتی تھی لیکن پوچھ نہ سکتی تھی مگر اس موہوم خواب خاتون کے گلے میں آواز تو تھی ہی نہیں، پوچھتی کیسے... تو کیا وہ چاہتی تھی کہ عملاً اسے بتایا جائے؟ اندھیرے میں بھی اس کے چہرے پر روشنی سی تھی۔ اس روشنی میں اس کے گھنے بال تکیے اور پلنگ کی پٹی پر اور فرش پر بکھرے ہوئے، میر نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال کر اس کے شانے پر، پھر گردن کے پاس سینے پر رکھا۔ ہلکی سی لرزش تھی، وہاں سینے کا ابھار نرم لیکن مضبوط محسوس ہوتا تھا۔ میر نے سرگوشی میں کہا۔ ''نور السعادۃ، تمہیں سردی لگ رہی ہے؟'' وہ کچھ نہ بولی۔ اتنا لمبا اور مربوط خواب کسی نے بھلا کاہے کو دیکھا ہوگا، میر نے اپنے دل میں کہا۔ اس کی ڈھونڈتی ہوئی انگلیوں کو گہرائی کا راستہ شاید ملنے والا تھا۔ وہاں ترائی اور ریشمی صنوبر کے جنگل تھے۔ میر نے دھیرے سے نور السعا... خواب خانم کا سر ذرا سا اٹھایا

اور اپنا دوسرا ہاتھ اس کی گردن میں یوں جھک کر حمائل کر دیا کہ دونوں کے منہ پاس پاس آ گئے۔ اسے لگا کہ موہوم وجود کے لب بہت ذرا سے وا ہوئے ہیں، اتنے کہ دانتوں کی گوہریں جھمک دکھائی دیتی ہے۔ میر نے اس کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ لطیف زعفرانی سیب جیسی خوشبو اس کی زبان پر تھی۔ لب برلب من نہادہ می گفت، جان تو بہ لب رسیدہ خاموش۔ سارے بدن میں نرم گرمی کی سی لہر۔ بے زبان بدن شاید اپنے اظہار کے لیے بیقرار تھا، اور لباس اس کے عجز بیان کی دلیل تھا۔ میر نے ذرا جھک کر اور آگے بڑھ کر ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے اتارا۔ وہ اس قدر ہلکی تھی کہ ہاتھ کا نیچے کھسکا لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ (وہ لڑکی موہوم تھی نہ، سب کچھ آسان تھا) میر کا ہاتھ اب اس کی کمر اور کولھوں پر تھا۔ وہ پشتہ دیوارِ خلد، وہ شمسینِ محشر زا، اور وہ قبہ ہائے گلناری کی نرمی۔ کاش یہ دیوارِ کاشانی درمیان نہ ہوتی۔ اب میر کا دھڑ پلنگ پر تھا۔ آگے کے لیے جگہ کم تھی، مگر نور خانم... خواب موہوم نے اپنا بدن شاید چرا لیا، یا جسم نے خود بخود راہ ہموار کر دی، کہ میر کو بھی اس ذرا تنگ سے بستر پر جگہ مل گئی۔ اب اس دوسرے بدن کے خطوط کچھ نمایاں ہو چلے تھے۔ میر کا ہاتھ کمر اور کولھوں کے نیچے سے (لامحالہ) کھسک کر سامنے کی طرف سینہ و بغل کی لطیف وادی میں سرگرداں تھا۔ دو پستاں ہر یکے چوں قبۂ نور، حبابے خاستہ از عین کافور۔ میر کو جامی کا شعر یاد آیا۔ کاش ذرا روشنی ہوتی۔ تھوڑی سی روشنی گریبان سے پھوٹ رہی تھی، گویا صبح ہونے والی ہو۔ پستاں ہمہ نور و سینہ اش جملہ لطیف، یک صبح دو آفتاب نشیندہ کسے۔ کمال ہے، یہ شعر محمد علی حشمت کا کب اور کہاں یاد آیا۔ میر صاحب تو خود زنانہ اور مردانہ دونوں سامانِ حسن کا مکمل نمونہ تھے۔ کاش یہ سب شعر میں بہ آواز بلند پڑھ سکتا۔ مگر لوگ جاگ جائیں گے، اور نہ بھی جاگیں تو یہ موہوم بیگم تو شاید سن بھی نہیں سکتیں، کسی اور عالم کی مخلوق معلوم ہوتی ہیں۔ بدن

میں اس کے تھی ہر جائے دل کش، بجا بے جا ہوا ہے جا بہ جا دل۔ میر نے ایک عمر کے بعد اسی لمحے کو یاد کر کے یہ شعر کہا تھا۔ نور السعادۃ... خواب خاتون کا ہاتھ، جو ماتھے پر تھا، منہ سے منہ ملتے ہی اب میر کی پیٹھ پر آ رہا تھا، پھر جب میر کا ہاتھ سامانِ حسن کے میر فرش تک پہنچنے کی کوشش میں تھا تو کسی طرح وہ نوری ہاتھ... نور السعا... نور کا ٹکڑا ہاتھ، نور... اجنبی لڑکی اور میر کے جسموں کے بیچ میں تھا جہاں دونوں کا سینہ اور شکم ایک دوسرے سے چسپاں تھے۔ پھر وہ ہاتھ چپکے سے اندر تک رینگ گیا۔ میر کو وہم سا ہوا کہ نیچے جو بدن ہے اس نے اپنے عجزِ بیان پر قابو پا لیا ہے، بند ڈھیلے ہو رہے ہیں۔''

کہانی کے نیچے عمر شیخ مرزا، مرقوم تھا۔

میں نے دوسرا پتہ اٹھایا تو اس پہ یہ کہانی اُبھر رہی تھی۔

''میرے بالکل قریب ہی چار کہاروں کا ایک ہوا دار رکا ہوا تھا۔ اس میں ایک بسنتی پوش۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری نگاہ اٹھی تو اٹھی ہی رہ گئی۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ، بڑی بڑی سیاہ روشن دلچسپ آنکھیں، گھنی بھنوؤں کے نیچے سے مجھے دیکھتی ہوئی۔ لمبے سیاہ بالوں کی کھجوری چوٹی سینے پر پڑی، موباف کے بغیر ہی اتنی بھاری کہ گات کو دبائے دیتی تھی۔ ہلکے کبریتی کام کی زرد ململ کا گھیر دار جامہ، جس کے دامن پر ذرا بھاری کشمیری کام بنا ہوا تھا۔ جامہ کمر پر بے حد تنگ، یا شاید کمر ہی موے میاں کی طرح باریک تھی۔ اوپری بدن پر تنگ کرتی، جس کے نیچے مخملی پیٹ جھلکتا ہوا۔ کرتی کے نیچے پڑا تے کی انگیا کسی ہوئی۔ لمبی گردن میں سرمئی سچے موتیوں کا ہار۔ گات کے بیچوں بیچ، گردن سے ذرا نیچے نیلم کی دھکدھکی، جس کے چاروں طرف ہیرے جڑے ہوئے۔ کانوں میں مٹر کے دانے کے برابر بالکل یک رنگ زمرد کے گوشوارے جن پر جے پوری مینا کا کام، ناک میں چنے کی دال کے برابر

یاقوت کی کیل۔ کلائیوں میں سبز کریلیاں، ان کے ساتھ ٹھوس سونے کی شیر دہاں۔ پاؤں میں سنہری جگمگ کرتی جوتیاں، اتنی نیچی دیوار اور مختصر دوڑ کی، کہ بمشکل پنجوں اور ایڑی کو ڈھانکتی تھیں۔ باقی پیر پر نگار کے نقوشِ پیچاں صاف نظر آتے تھے۔ ہاتھوں کی محض ایک ایک انگلی میں الماس کی انگوٹھی، ناخنوں پر کچھ گلابی رنگ کا چمکیلا روغن، کف دست پر بھی پیچ دار نگار نمایاں۔ داہنی کلائی پر سرخ چمڑے کی پٹی پر ایک شاہیں بچہ۔ جامے کا دامن تھوڑا اٹھا ہوا کہ نازک نازک ٹخنے اور سڈول پنڈلیوں کی بناوٹ نظر آتی تھی۔ پاؤں میں سنبھل پوری پازیبیں۔ گلبدن کا پائجامہ اس قدر کسا ہوا کہ لگتا تھا بدن پر پہنا نہیں مڑھا گیا ہوگا۔"

اس کہانی کے نیچے بھی عمر شیخ مرزا مرقوم تھا۔ عمر شیخ مرزا بھی بدن کی لطافتوں، نزاکتوں اور رعنائیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ کسی نے میرے شانے تھپتھپائے اور کہا کہ یہ پتے جن پر یہ کہانیاں رقم تھیں، 'شجرۃ الخلد' کے تھے۔

O

میری یاترا جاری تھی۔ ایک پہر، بدن دھوپ میں کٹتا تو دوسرا پہر زلف کے ظلِ ممدود میں... اچانک میں نے دیکھا کہ امرپالی، شکنتلا، پدماوت، دروپدی، کادمبری، مالتی مادھوی، رادھے، مینکا، انگ سینا، روپ لیکھا، کملا، نمرتا، ساوتری، دمینتی — سبھی سندر بدن شمع کی طرح جل اٹھے ہیں۔ چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا تو حسینان مہ جبیں، خوبان روزگار کا جمگھٹا تھا۔ میں تو ایک ہی ساعت میں جانے کتنے مقامات کشف و

کشاف سے گزر گیا... پدماوت ایک طرف قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کے کومل کٹیل کیش، ناگن کی طرح لہرا رہے تھے۔ مانگ، رات میں بھی آکاش گنگا کی طرح جگمگا رہی تھی۔ اس کی کالی بھنویں ایسی تھیں جیسے تنا ہوا دھنش۔ نین جیسے مان کا سمندر، ادھر، امرت رس سے بھرے ہوئے۔ کپول، نارنگی کے دو انمول ٹکڑوں کی مانند، ایسا لگ رہا تھا جیسے پشپوں کے پراگ اور امرت رس کو ملا کر کسی نے کتھے کی سرنگ ٹکیا باندھ دی ہو۔ کانوں کے چمکیلے کنڈل چاند اور سورج کی طرح آویزاں۔ پھر میری نظر کچوں کے ابھار کی طرف اٹھ گئی جو سونے کے لڈو کی مانند اور امرت سے بھرے ہوئے کیتکی کے سوئیوں کے سمان لگ رہے تھے۔ اتنے نکیلے استن کہ کچوں کو ویدھ کر نکل جانا چاہتے ہوں۔ چندن کے پتر کی طرح پیٹ اور نابھی کنڈ بنارس کی طرح پوتر۔ پیٹھ ملیا گری چندن سے بجی ہوئی اور اس سے کالا ناگ لپٹا ہوا اور اس کے نتمب ایسے کہ سبھی کے ہوش اڑ جائیں۔ گج گامنی بھی شرما جائے اور نابھی کنڈ کے نیچے ہرنی کا پد چنھ۔ دوسری طرف امرپالی رقص میں مصروف تھی۔ اس کے پاؤں کی جھنکار میں کئی یگوں کی راتیں تھم گئی تھیں۔

میں شہر بدن کا طواف کر رہا تھا کہ اچانک بدن کے بُرج و محراب پر نظر پڑی۔ بُرج پر کچھ کچھ ابھر رہا تھا اور میں اس ابھرے ہوئے کو کچھ یوں دیکھ رہا تھا:

> ''اس نے ایک بار پھر آئینہ دیکھا، ماتھے پر بندیا، ناک میں نتھ، گلے میں جگ مگ جگ مگ کرتا قیمتی طلائی ہار، کان میں بندے جن میں جڑے یاقوت پارے سورج کی کرنوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، ہاتھ میں کنگن، بدن پر زربفت کی ساڑی جس پر نگاہ کا ٹھہرنا محال، نکھ سے شِکھ تک سولہ سنگھار میں ڈوبی، چہرہ ہلدی، کنکو اور چندن کی مالش سے کُندن کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھنے میں ایسی محو تھی کہ اُسے اِرد گرد کی سدھ نہ رہی۔''
> (ستی — سلام بن رزاق)

دوسرے بُرج پر کچھ مدغم سائے مجھے نظر آ رہے تھے جو کچھ بول رہے تھے اور مجھے ان شبدوں کی سرگوشی سنائی دے رہی تھی......

"تم چپ چاپ میرے ساتھ لیٹی رہو۔ میں تمہاری کہانی تم سے نہیں، تمہارے بدن سے سننا چاہتا ہوں۔ تمہاری سانسوں کا آواگون۔ تمہارے دل کی دھڑکنیں سننا چاہتا ہوں۔ تمہارے یہ ہونٹ جنہیں اس نے چوسا تو غالباً سینکڑوں بار ہوگا مگر چوما شاید کبھی نہیں اور تمہارے گلابی چہرے پر یہ نیلی جھیلیں جن میں مجھے ساتوں بڑے سمندر ایک ساتھ ٹھاٹھیں مارتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر جن کی اچھل کو داس کمبخت نے غالباً کبھی نہ دیکھی تھی۔ تم ایک بھرپور کہانی ہو للّی۔ مجھے چند لمحے اس مندر میں جی لینے دو للّی۔ تم نے ورڈزورتھ کا نام سنا ہے نہ للّی۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک رات اپنی نظموں کے ایک مجموعے کے پورے عوضانہ سے گلاب کی پتیاں خرید کر ان کے بچھونے پر سوگیا تھا۔ تمہارا جسم گلاب کی پتیوں سے بنا ہے۔ مجھے اس میں کھو جانے دو۔ اس کی مہک میں سو جانے دو۔"

(ابھیشاپ — بلراج ورما)

میری آنکھیں ان گلابہ سطروں پر تھیں اور میرا پورا وجود گلاب جسم کی خوشبوؤں سے سرشار ہو رہا تھا۔ بدن کی مہک یقیناً پُر جمال اور پُرکشش ہوتی ہے۔ مگر بدن کے جمال کی تشنگی وصال سے ہی ختم ہوتی ہے۔ جمال ذہنوں میں کیسے کیسے خیال جنم لیتے ہیں۔ جمال تو ایک مقناطیس ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ اچانک میری نظروں کے سامنے شبدوں کا عکسِ جمال لہرانے لگا اور میں اس عکس کے باطن میں یوں اترنے لگا۔

"لتیکا رانی اس کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں خاصی بڑی بڑی اور پُرکشش تھیں اور کچھ کہتے ہوئے وہ کتنی بار پلکیں جھپکاتا اور بہت سادہ و معصوم نظر آتا۔ مسیں کچھ کچھ بھیگ چلی تھیں اور ہونٹ بہت پتلے اور باریک تھے۔ چہرے کے سانولے پن نے اس کو اور زیادہ پُرکشش بنا دیا تھا۔ لتیکا رانی کا یکایک جی چاہا کہ وہ اس کے ہونٹوں کو چھو کر دیکھے کتنے نرم و

نازک ہیں، لمحہ بھر کے لیے اس کو اپنی اس عجیب سی خواہش پر حیرت ہوئی اور وہ مسکراتی ہوئی اس کے تھوڑا قریب سرک آئی۔ لڑکے نے کچھ چور نظروں سے لتیکا کی طرف دیکھا اور پھر جلدی جلدی 'لائف' کے ورق الٹانے لگا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں اور چہرہ کسی حد تک سرخ ہو گیا تھا۔ لتیکا اس کی اس پریشانی پر مسکرا اٹھی۔ وہ اس کے اور قریب سرک آئی۔ اس کی گھبراہٹ سے وہ اب لطف اندوز ہونے لگی تھی۔ لتیکا کی بھی نگاہیں ''لائف'' کے الٹتے ہوئے صفحوں پر مرکوز تھیں۔ ایک جگہ نیم عریاں تصویر آئی اور لڑکے نے فوراً وہ ورق الٹ ڈالا لیکن دوسری طرف بوسے کا منظر تھا۔ اس نے کچھ گھبرا کر لتیکا کی طرف دیکھا اور ''لائف'' بند کر کے تپائی پر رکھ دیا...

''گھر پہنچ کر وہ سیدھی غسل خانے میں گھس گئی اور اپنے سارے کپڑے اُتار دیئے۔ اس نے ایک دفعہ اپنے عریاں جسم کو غور سے دیکھا اور شاور کھول کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ پشت پر پڑتی ہوئی پانی کی ٹھنڈی پھواریں اسے عجیب لذت سے ہمکنار کر رہی تھیں۔ وہ بیسیوں دفعہ اس طرح نہائی تھی لیکن ایسا عجیب سا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد تولیے سے جسم خشک کرتی ہوئی وہ باہر نکل آئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے تولیہ پلنگ پر پھینک دیا اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر برہنہ جسم کو ہر زاویہ سے دیکھنے لگی۔''

(بگولے — شموئل احمد)

بچ بدن کی جمالیاتی کشش خود کو بھی بے خود کر دیتی ہے۔

''چند لمحوں میں ہی وہ مادر زاد ننگی ہو گئی۔ اس نے حیرت، خوف اور حسرت سے اپنے جسم کو دیکھا۔ پورا بدن صندل کی شاخ کی طرف سڈول اور چمکدار تھا۔ بدن کے سارے قوسین اس طرح اُبھر آئے کہ نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ وہ خود اپنا حسن دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ کلیجے میں ہوک سی

اٹھی اور وہ اپنی چھلکتی چھاتیوں کو بانہوں میں چھپائے ایک ایک سیڑھی پانی
میں اُترنے لگی۔'' (ستی — سلام بن رزاق)

یہ سب پڑھتے اور سوچتے ہوئے جانے کب مری آنکھ لگ گئی۔ میں نیند کی نرم گداز اور حوران پری خصال کے خواب وصال میں محو تھا کہ کسی نے مجھے بری طرح جھنجھوڑا۔ دیکھا تو میں اس جگہ پہ نہیں تھا، جہاں آنکھ لگی تھی۔ یہ جگہ تو بالکل اجنبی سی لگ رہی تھی۔ میں کسی شمشان گھاٹ میں تھا۔ جہاں لوگ جلی ہوئی لاشوں کا گوشت کھانے اور جماع بالمحرمات میں مشغول تھے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ یہ چاروک لوکا یک ہیں۔ کپال میں شراب پی کر یہ اسی طرح کی حرکتیں کرتے ہیں، یہ دیو کنیاؤں کے جسمانی جمال کی لذتیں کشید کر کے روحانی ارتقاء میں مصروف ہیں۔ میں کچھ دور آگے بڑھا تھا کہ گنگا کے شمشان گھاٹ میں ایک نیم برہنہ تانترک بابا سادھنا میں مگن نظر آیا۔ وہ ہم ہم، کم کم کا وِرد کر رہا تھا اور ہر طرف اوم سواہا کی گونج تھی۔ یوگ اور بھوگ کا اشتراک دیکھ کر میں تو ادھ بھت تھا کہ ایک جوگنی آئی اور اس نے اپنے شہوانی جمال سے برانگیختہ کرنے کی کوشش کی۔ دیکھا کہ ایک شخص جوگنی سے بھوگ میں مصروف ہے اور گرو جی کہہ رہے ہیں کہ مجامعت کے دوران منی کا خروج ساری روحانی شکتی چھین لے گا۔ اس لیے وہ تانترک تکنیک کے ساتھ مقمن میں مصروف تھا۔ شام ہوئی تو پورا ایک قافلہ مدہوشی کے عالم میں ایک دوسرے میں لین ہوگیا۔ ایک دوسرے کے بدن کے جمال کی رعنائیوں میں کھوگیا۔ مجامعت کی یہی لذت آفریں شام انہیں نجات کی صبح تک پہنچاتی ہے۔ وہ منتر جاپ رہے تھے۔ اوم منی پدمے۔ کسی نے بتایا کہ کہہ رہے ہیں کہ لنگم یونی میں ہے۔ مجھے حیرت ہورہی تھی کہ میں کہاں دیارِ غیر میں بھٹک رہا تھا۔ سارا بدن تو یہاں ہے۔ بدن کا جمال بھی اور وصال بھی ایسا جو نجات کا ضامن ہے۔ تخلیقیت کا مظہر تو یہی بدن ہے اور سب سے زیادہ بدن یہیں ہے۔ تنتر کی اساس بدن پر ہے اور بدن کے تحرک میں ہی تخلیقیت کا علو مضمر ہے۔ بدن بڑی مقدس چیز ہے۔ میں نے یہاں آکر جانا۔ کیونکہ یہاں زنانہ اعضائے تولید کی پرستش، باجماعت مجامعت اور چکر پوجا ہوتی ہے...

میں بڑی شردھا کے ساتھ کونارک کے مندر میں داخل ہوا۔ پھر کھجوراہو اور اجنتا بھی گیا جہاں مندر میں منقش جمالیاتی مظاہر اور نقوش Erotic Sculptures دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جمال و جلال کا اتنا خوبصورت وصال، ایسا منتھن... کائناتی تخلیق اور انسانی اعضاء کے درمیان ہم آہنگی کا منظر بہت خوشنما لگ رہا تھا۔ مندر کے ایک گوشے میں دیوداسیاں، جے دیو کا ''گیت گووند'' پڑھ رہی تھیں اور ان کی نگاہیں بدن اور بستر پر مرکوز تھیں۔ رقص جاری تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مرد عورت کے بدن کے Sensous mingling سے Sublime Purity حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے۔ ماورائے ذہن لذت و نشاط کا حصول ہی اس رقص کا بنیادی مقصد تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں Perfumed Garden کی سیر کر رہا ہوں اور میں اب بے خودی، لامکانی اور لازمانی میں تھا۔ تبھی دو پُر اسرار سائے سرگوشیاں کرتے نظر آئے......

''کنسے، رنخ، فرائیڈ، ہیولاک ایلس، جانسن اینڈ ماسٹرز، شیرلی ہائٹ، نینسی فرائیڈے اور دی جوائے آف سیکس اور اینی دومن کین اور سیکڑوں سیکس مینولز نے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ کیونکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مسئلہ ہم بستری کا ہے۔ اسی لیے وہ ایک بستر سے دوسرے بستر تک بھٹکتے رہتے ہیں اور خود ہی بستر بن جاتے ہیں اور جب کوئی بستر بن جاتا ہے تو وہ اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے۔ عورت کے پاس کئی انگ ہیں۔ سیکس کے ہر وار سے بیدار ہونے کے لیے اور اسے جذب کر لینے کے لیے۔ مرد کے پاس تو صرف ایک ہی انگ ہے اور وہ بھی کون سا یقین آمیز ہے۔ عورت شکتی کا سرچشمہ ہے۔ وہ شکتی ہے جنسی تسکین کے لیے مرد کے لیے خود لذتی اور مباشرت میں کوئی گہرا فرق نہیں۔ مرد کو ہمیشہ مردانگی کی فکر ہوتی ہے۔ مرد کی حدیں ہیں، گتی محدود ہے، جب بھی وہ نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے تو سمٹ جاتا ہے۔ عورت آل ایمبریسنگ ملٹی پل آرگزم کے قابل ہے اور مرد تو محض ون ڈائی مینشن ہے۔''

''تمہیں اپنے پستان بھاری کیوں لگتے ہیں۔ یونی ایک اندھیری گپھا کیوں نظر آتی ہے۔ گربھ آشے سے تم آزاد کیوں ہونا چاہتی ہو۔''

''وہ لوگ جو سیکس کے بڑے ماہر ہیں جن کے لیے آرگزم، جنسی قوت اور نقطۂ عروج کا سوال ہے جن کی جنسی تسکین، عضو تناسل کی لمبائی چوڑائی پر منحصر کرتی ہے۔ جو جنسی عمل میں طرح طرح کی ٹیکنیکس کا استعمال کرتے ہیں اور آرگزم کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔ وہ کیوں ایک جسم سے دوسرے جسم تک بھٹکتے رہتے ہیں۔ غیر مطمئن۔ مجھے جنسی مسرت چاہیے۔ لیکن میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ انسان کے روپ میں اس کے بارے میں میرا رویہ کیا ہوگا۔ نا کہ اس کی عضویاتی ظفریابی کیا ہے؟ اس بارے میں تو میں اسے دیکھ کر ہی پیشین گوئی کر سکتی ہوں۔ لیکن انسان کے روپ میں۔ اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتی۔ یہی سب کچھ فرق کر دیتا ہے۔ میں کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کا منظر دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہوں بجائے اس کے کہ میں کسی ایسے مرد سے ہم بستری کروں جس کا صلہ محض آرگزم ہے۔ وہ تو میں خود بھی حاصل کر سکتی ہوں بغیر کسی مرد کی مدد سے، لیکن کیوں؟ جس مرد نے یہ آرگزم دیا ہے نہ میں اسے چاہتی ہوں اور نہ وہ مجھے چاہتا ہے۔ یہ تو جنس کی عیارانہ چال ہے، اگر مباشرت اپنے سے وسیع ذاتی کمیونی کیشن کا جزو نہیں بن جاتی تو یہ جسمانی انجینئرنگ کا شاہکار ہے۔ ایسا پل ہے جس کے اس کنارے سے اس کنارے دو جسموں کے ستون ہیں۔ لیکن جو کہیں بھی نہیں لے جاتا اور جس کے کناروں کے بیچ کوئی ندی نہیں بہتی۔''

(بستر سے پرے بستر کی باتیں — دیویندر اسر)

انہیں تو عریاں دیکھ چکا ہوں۔ جن کی کنواری چھاتیاں مجھے دیکھ کر بھیگ جاتی تھیں اور میں گھن کھا کر ہٹ جاتا تھا۔ جب تک میں ان جوان عورتوں کے سامنے رہتا ان کے سینوں کے بٹن تڑاتڑ ٹوٹتے رہتے اور میں ان پر ہر

وقت لرزتے ہوئے ماہتاب کا عکس دیکھتا رہتا۔ وہ سب مکمل ایثار و قربانی بن کر میرے سامنے آتی تھیں۔" (آگ الاؤ صحرا — قمر احسن)

میں شہر بدن کے کچھ Snapshots لیتے ہوئے ایک محلے کی طرف مڑا تو وہاں مکعوبی جمال سے لبریز کچھ زرخیز عورتیں نظر آئیں۔ ان کے چہروں پر شادابی تھی اور وہ کافی آسودہ اور مطمئن نظر آرہی تھیں۔ مایئول سے میری نگاہ مال پر چلی گئی۔ اچانک ایک شخص نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور میری حیرت کے طلسم کو توڑتے ہوئے کہا۔ تم نے کبھی بیوٹی آف پریگنینسی دیکھی ہے؟ یہ بدن کا ابھرن دیکھو گے تو تمہاری آنکھیں بس دیکھتی ہی رہ جائیں گی۔ یہ سنتے ہی کئی ورق میری نگاہوں کے سامنے الٹ گئے۔ ڈیمی مور اور کئی ایک تصویریں ذہن کی اسکرین پر نمودار ہوگئیں اور میری نگاہوں کے سامنے یہ عبارت روشن ہوگئی......

"حاملہ عورت معمولی یا غیر معمولی، کسی بھی حالت میں غیر حاملہ عورت سے زیادہ جنسی بھوکی ہوتی ہے۔ اپنے محبوب سے زیادہ اُنس رکھتی ہے۔ اس کی زبان اور رانوں کا لالچ بڑھ جاتا ہے۔"

"جس وقت وہ مری تو اس کی رانوں کے درمیان زرد گاڑھا سیال خارج ہو رہا تھا۔" (ماں کی موت — انورسن رائے)

اور اسی روشنی میں، میں نے جانا کہ بدن ہی سچ ہے، باقی سب جھوٹ... تبھی چند سطریں روشن ہوئیں......

"جسم اس کے نزدیک سب سے بڑی سچائی تھا اور وہ اس کا اعلان شدت سے کرتی تھی کہ یہ سچ چھپانے کے لیے نہیں ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ جتنا ظاہر کریں گے اتنا ہی یہ خوبصورت لگے گا۔ وہ کہتی کہ سچ صرف آسمانوں پر ہی نہیں، زمین پر بھی ہے۔ جب تک زمین کے سچ پہ ایمان نہ ہوگا آسمانی سچ بھی جھوٹ ہی بنا رہے گا۔ آسمانی سچ کی تلاش میں زمینی سچ کی نفی کرتے کرتے ہم حقیقت سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

وہ سچائی کہ جس کا نام جسم ہے، وہ اسی نوجوان آرٹسٹ کے پاس ہے۔ لذت کا ایک نیا در کھلا اور اسے یوں لگا کہ جیسے ان بوڑھے کھوسٹوں کے پاس وہ مسلسل جھوٹ بولتی رہی ہے اور سچ پہلی بار اس کی زندگی میں اب نازل ہوا ہے۔ اس نے اس نوجوان کو سچائی سمجھ کر سینے سے لگا لیا۔ یہ تجربہ دونوں کے لیے بڑا تحیر آمیز اور مستی سے بھرا ہوا تھا، وہ دونوں اس میں ڈوب گئے کہ انہیں ایک مدت اپنا ہوش بھی نہ رہا۔ یہ جسم اور اس کی لذتوں کی دنیا تھی۔ بدمستی و سرشاری کا ایسا عالم جس میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آنکھیں آپ سے آپ بند ہو جاتی ہیں۔ کانوں کو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ عقل کو کچھ بجھائی نہیں دیتا، اختیار ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، راستے گرد آلود ہو جاتے ہیں، ہوائیں شبنمی ہو جاتی ہیں اور چاند پر کہرا چھا جاتا ہے۔

وہ لڑکی جسے سچ کی تلاش تھی، یہ سچ اب اس کے جسم کے ایک ایک حصے میں اتر آیا تھا اور ہر حصہ اس کے موجود ہونے کی گواہی دیتا تھا۔ اس کا جسم جو پہلے قدرے سپاٹ دکھائی دیتا تھا اب اس کے خطوط ابھرنے لگے۔ خم اور واضح ہو گئے۔ زاویوں میں دلکشی کے پہلو نکل آئے۔ اس کا جسم بھرا بھرا سا نظر آنے لگا۔ (روسیاہ — منیر احمد شیخ)

وہ چیخ چیخ کر کہنا چاہتی تھی کہ یار آشوتوش، میری بات مانو، اللہ قسم سارے نظریے آدھے ادھورے ہیں۔ میری لپسٹک، میری مخروطی انگلیاں، میرے دہکتے رخسار سچے ہیں۔ جو شے اپنی بھرپور، زندہ، دھڑکتی، لو دیتی، محرکات کا سبب بنتی، بند دروازوں اور بند امکانات پر دستک دیتی ہوئی، خود کو جتنی دیر بھی زندہ رکھ سکے اس شے کی زندگی کو فانی نہ کہو، آشوتوش میرا یقین کرو ہر زندہ گرم، لذت رسا اور حوصلہ بخش لمحۂ موجود لافانی ہے۔

(نمک — اقبال مجید)

اور یہ لافانی لمحے، بدن کے جمال سے جنم لیتے ہیں، تبھی اندھیری راتیں بھی

اجلی ہو جاتی ہیں......

''گووا میں مدن جنگلات کے محکمے کا افسر ہے۔ میں اس کے پاس سے لوٹ رہی ہوں۔ کل رات جب میں بستر میں آئی اور مدن نے مجھے آٹے کی طرح گوندنا شروع کیا تو میں نے کہا۔ ''میں تو گندھی گندھائی ہوں۔ تم صرف روٹی بیلو، اگر بیل سکو۔ لیکن نہ تو مدن کے پاس پولیاٹ تھا نہ بیلن۔ اس نے مجھے چادر پر چادر کی طرح پھیلا دیا۔''

''تم نے سنا ہوگا مدن۔ ایک دن مہاراج شمبھو سنگھ دربار میں سنہاسن پر بیٹھے تھے۔ منتری کامناتھ بھی وہیں موجود تھے۔ اچانک ایک حسینہ دربار میں گھس آئی۔ وہ اتنے مہین وستر پہنے ہوئے تھی کہ اس کا انگ انگ نظر آ رہا تھا۔ اس کا بدن شہوت سے لرزاں تھا۔ وہ داہنے ہاتھ میں پکڑا گلاب کا پھول سونگھتی اور بار بار انگڑائیاں لیتی تھی۔ تو جانتے ہو وہ حسینہ صرف شہوت سے مغلوب نہیں تھی۔ وہ معزز سماج کے ٹھیکیداروں کے بنائے اصولوں پر تھوکنے آئی تھی۔''

''کہاں کھو گئیں؟'' مدن نے مجھے بانہوں میں بھر لیا اور بولا۔ ''دیکھو ڈارلنگ! جب کہ تم بے لباس ہو چکی ہو مگر بریسیر کے نشان اب بھی تمہارے بدن پر باقی ہیں۔ تمہارے خلیے یہاں وہاں سے دب گئے ہیں۔ جہاں تم بریسیئر باندھتی ہو۔ دیکھو ڈارلنگ جب کہ تم بے لباس ہو مگر پینٹی کے نشان اب بھی تمہارے بدن پر کندہ ہیں۔ جانی بوجھی صداقتوں کی طرح اندھیرے میں چمکنے والی سچائیوں کی طرح۔'' (تیرتھ — م ناگ)

بدن، اندھیرے میں بھی چمکنے والا سب سے بڑا سچ ہے، یعنی ایسا سچ جسے رات کا اندھیرا بھی چھپا نہیں سکتا کیونکہ بدن تو روشنی اور سندرتا کا سب سے بڑا متحرک استعارہ ہے......

''عورت کے جسم کی خوبصورتی کو تو تصویر اور بت بنانے والوں نے پینٹ

اور نقش کرنے کے قابل سمجھا ہے۔ اسی میں تو فارم کا راز ہے۔ یہی تو سنسنی کا، کشش کا، تحسین کا مرکز ہے۔''

''کواڑ کے نیچے روشنی بجھ جاتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ رنجن جی مجھے کھڑا پاتے ہیں۔ بانہوں میں لے لیتے ہیں— وقت گزرتا ہے/ انہیں کمرے میں لے آتی ہوں/ اس رات وہ مجھے چھوتے ہیں/ میں بھی چھو پاتی ہوں/ ہاتھوں میں لے کر ان کا چہرہ چومتی ہوں/ ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہوں/ان کے پٹھے سہلا کر ان کے کندھے محسوس کر پاتی ہوں/ان کے بدن کی مہک سونگھتی ہوں/محسوس کرتی ہوں چھونے کی راحت کیا ہوتی ہے/ مجھے سینے سے لگا کر زور کی آہ بھرتے ہیں/ میرا جسم ان کے جسم کا دباؤ محسوس کرتا ہے/ میں کچھ کچھ سمجھ جاتی ہوں وہ کیا چاہتے ہیں/ اندو جی، رضیہ کی باتیں یاد آتی ہیں/پَر اتنی جلدی! /نہیں/ ان کی بانہہ پر پڑی رہتی ہوں/ان کا ہاتھ میرے سینے پر پڑا رہتا ہے/ایک بار ہاتھ پیچھے لے جا کر ہُک کھولنا چاہتے ہیں/ میں ان کی ٹھوڑی اٹھا کر انہیں ایسا کرنے سے منع کرتی ہوں/ پہلے نہیں مانتے، پھر مان جاتے ہیں/ بڑے پیارے لگتے ہیں/ پھر نہ جانے کب پچھتاوا ہوتا ہے کہ وہ مان گئے۔''

''میں خوبصورت ہوں اس میں شبہ نہیں۔ میرے جسم کی ساخت بہت اچھی ہے۔ ۳۴-۱۸-۳۵ ہوں۔ رنگ بہت صاف ہے۔ بال بہت اچھے ہیں۔ جلد میں کہیں کوئی داغ نہیں۔ بے داغ ہوں۔ جسم کسا ہوا ہے۔ سہیلیاں غلط نہیں کہتیں جو کپڑا پہن لیتی ہے جی اٹھتا ہے۔''

(سفر بے منزل— ریوتی سرن شرما)

جسم کا جمال تو معجون شباب آور ہے... تبھی تو ایک جسم دوسرے جسم کے جمال میں اپنی پناہ ڈھونڈتا ہے اور پھر جسم کی اتھاہ گہرائیوں کی یاترا شروع ہو جاتی ہے:

''رات شباب پر ہے۔ خواب گاہ میں ہلکی سی سرخ روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ہم دونوں بستر پر دراز ہیں اور ایک دوسرے کو محسوس کرنے، ایک دوسرے میں شریک ہونے اور ایک دوسرے کو قبول کرنے کے عمل میں مشغول ہیں۔ وہ

میرے ہونٹوں پر ظہور پذیر ہوتی ہے اور میں اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوتا ہوں۔ وہ میرے ہونٹوں سے ٹھوڑی پر پہنچتی ہے اور ٹھوڑی سے نکل کر گلے کے ذریعہ سینے پر آتی ہے۔ میں اس کے لبوں سے اٹھ کر ستواں ناک کو چھوتا ہوا پیشانی پر طلوع ہوتا ہوں۔ وہ میرے سینے سے پرواز کرتی ہوئی پھر ہونٹوں پر آبیٹھتی ہے اور میں اس کی پیشانی سے ہوتا ہوا رخساروں پر پھیل جاتا ہوں اور رخساروں سے آگے بڑھتا ہوا پھر لبوں پر عیاں ہوتا ہوں۔ وہ میرے ہونٹوں سے اٹھتی ہے اور رخساروں کو چھوتی ہوئی شانوں پر استراحت پذیر ہوتی ہے۔ میں اس کے لبوں سے گردن پر سرکتا ہوا زلفوں میں روپوش، ہوجاتا ہوں اور پھر زلفوں سے طلوع ہوکر شانوں کے ذریعے ہاتھوں کی انگلیوں کو جا چھوتا ہوں اور ہاتھوں کی انگلیوں سے نکلتا ہوا پیروں پر آکر تلوؤں کو گدگداتا ہوں۔ وہ میرے شانوں سے ہوتی ہوئی سینے پر اپنا سر رکھ دیتی ہے اور سینے سے دل میں اُتر کر جسم کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہوجاتی ہے۔ میں اس کی پلکوں پر جا بیٹھتا ہوں اور پلکوں سے آنکھوں میں اُتر کر جسم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ ہمارے جسم تپنے لگتے ہیں اور جسموں کی گرمی سے سارا کمرہ جلنے لگتا ہے۔ عین اس وقت جب ہمارے جسم ایک دوسرے میں تحلیل ہونے لگتے ہیں۔ ایک زوردار برق چمکتی ہے اور لمحہ بھر کے لیے ساری کائنات رنگ ونور میں نہا جاتی ہے اور پھر ایک سکوت سا طاری ہوجاتا ہے۔ ایک سناٹا سا پھیل جاتا ہے۔ ایک خاموشی سی چھا جاتی ہے۔ دفعتاً میں دیکھتا ہوں کہ وہ میرے پہلو میں نہیں ہے۔''

(جسم + جسم = ؟ — محمود شاہد)

''کیا ہوا — آنکھیں کیوں بند ہیں — موڈ نہیں ہے کیا — ؟ نہیں ایسی بات نہیں — اس طرح زیادہ اچھا لگتا ہے کہہ کر پھر آنکھیں موند لیں۔ وہ کس منہ سے بتاتی کہ آنکھ کھولنے پر تم دکھائی دیتے ہو اور بند آنکھوں میں وہ جس

نے مجھ پر جسم کے تمام رمز منکشف کیے۔ تم آنکھ کھول کر اپنا کام کرتے رہو اور مجھے بند آنکھوں میں اپنا کام کرنے دو۔ شہاب کا لمس اور اس کی باتیں یاد کر کے وہ اندر ہی اندر محظوظ ہو رہی تھی۔ اس نے وریشہ کو بتایا تھا تمہارا جسم ایک کائنات ہے۔ ''مجھے سعادت ملی ہے، اس کے ہر گوشے اور خطے میں جا کر سیاحت کا لطف حاصل کرنے کی۔ میرے نزدیک سفر کے معنی صرف جہاز میں گھسنے اور نکل آنے کے نہیں۔ ایک ایک منظر کا حسن کشید کرنا چاہتا ہوں۔'' یہی سب کہتے سنتے اس نے وریشہ کی کایا پلٹ دی تھی۔ اسی نشہ و سرشاری میں اس نے پرویز کو اپنی مخملی بانہوں میں اتنے زور سے دبایا کہ پرویز حیرت زدہ رہ گیا گو کہ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔''

(ٹائی بریکر ـــــ شاہد اختر)

''اچانک دروازے پر کوندا سا لپکا۔ فہمیدہ صنم سامنے کھڑی تھی۔ اس نے مونگیا رنگ کے اونی شال کو عجب ڈھنگ سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا کہ اس کے بولتے بدن کی منہ زور گولائیاں کچھ اور واضح ہو گئی تھیں۔ مجھے لگا جیسے کمرہ اچانک گرمی سے بھر گیا ہے۔

اس پوری عورت کی پنچم سروں والی آواز میرے جسم کے سوئے ہوئے مساموں کو جگا گئی۔ شاعروں نے عورت کو جس قیامت سے تشبیہ دی ہے، وہ قیامت اپنی تمام تر قیامتوں کے ساتھ میرے وجود پر غمزوں کی چھریاں چلا رہی تھی ......

میں نے گھبرا کر باہر نظر ڈالی۔ برف باری کا زور بڑھ چلا تھا۔ مگر میرا جسم حرارتوں کے سمندر میں دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ دفتر میں ہو کا سناٹا تھا۔ بس فہمیدہ کا جسم بول رہا تھا۔ پھڑ پھڑاتا ہوا جیسے ابھی کپڑوں کی قید و بند سے آزاد ہوا چاہتا ہے...

کوثر کے جاتے ہی فہمیدہ اپنی معشوقانہ کارستانیوں میں لگ گئی۔ ایک انگڑائی

لے کر وہ بستر میں سمٹ گئی اور نیم وا آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔ اس کی ہری ہری آنکھوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے چرس کی خوشبو کا خیال آ گیا۔ فہمیدہ کے جسم کا نشہ جادو بن کر میرے سر پر سوار ہو چلا تھا۔ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر میں اس کا جسم سہلانے لگا۔ گویا مساج میرا خاندانی پیشہ ہو، فہمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کے گرم قندھاری ہونٹ میرے چہرے کو چاٹ رہے تھے۔ آگ لگ چکی تھی۔ میں نے اندھوں کی طرح اس کے جسم کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

فہمیدہ نے قمیض کے بٹن کھولے اور میرے سینے کو بیتابی سے چومتے ہوئی بولی۔

"مجھے مرد کے جسم میں سب سے زیادہ یہ حصہ پسند ہے۔"

... فہمیدہ کی چوڑیوں کی کھنکھناتی آواز سن کر میں ٹھٹھک کر کمرے کے باہر ہی رک گیا۔ فہمیدہ ڈاکٹر سے کہہ رہی تھی۔

"ڈاکٹر دار مجھے تمہارے سینے کے گھنیرے سیاہ بال بہت پسند ہیں۔ بالکل ریچھ جیسے اور ہاں تمہارے شانوں پر بھی بالوں کے گچھے ہیں۔"

دروازے کے سوراخ سے میں نے دیکھا۔ وہ بالکل برہنہ حالت میں ڈاکٹر کے سینے اور شانوں کو دیوانہ وار چوم رہی تھی۔ (الف لیلہ — فیاض رفعت)

ابھی یہ منظر دھندلا بھی نہیں ہوا تھا کہ کئی جلتے بھیگتے منظر آنکھوں میں طلوع ہو گئے ......

"وہ بری طرح بھیگ گئی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ جو اس کے بدن سے پوری طرح چپک گئی تھی۔ اس کی گردن لمبی تھی۔ بالوں کے گچھوں سے ہو کر پانی کے قطرے اس کی لمبی گردن سے ٹکرا کر اس کے بلاؤز کو تر کر رہے تھے۔ لمبی گردن۔ وہ تھوڑی دبلی پتلی تھی۔ وہ گوری نہیں تھی۔ رنگ ہلکا سانولا تھا۔ مگر بارش سے بھیگی ہوئی لڑکی ایک دم سے کمرے کی تاریکی میں ایک دوسرا ہی نقش بھر گئی تھی۔ یقیناً لڑکیوں کے

پورے بدن میں آنکھیں ہوتی ہیں۔'

(بارش میں ایک لڑکی سے بات چیت— مشرف عالم ذوقی)

''بڑی کاتیائن کے ہاتھوں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی، جیسے جاڑے کے دنوں میں صبح صبح منہ کھولنے سے اٹھتی ہے... اس کے ہاتھ میں ایک اسٹیل کی کٹوری تھی... کٹوری میں پگھلا ہوا اصلی گھی پڑا تھا۔ چھوٹی کا چہرہ قد آدم آئینے کی جانب تھا... اس نے سلیولیس سیاہ نائٹی پہن رکھی تھی... شاید نہیں۔ نائٹی نے اچانک اس کی عمر پہن لی تھی... اس چھوٹے سے کپڑے میں وہ ایک دم سے چھوئی موئی لگ رہی تھی۔ بڑھاپے اور جھریوں سے میلوں پیچھے۔ جہاں صرف ہنستا گاتا ڈھول بجاتا حسن ہوتا ہے۔ حسن کا ساز چھیڑنے والے جذبات ہوتے ہیں... اور جذبات کے پیچھے چھپی مجروح ہوسناکی ہوتی ہے... ''ہاں اب ٹھیک ہے۔ لیٹ جاؤ اور کپڑے اتارو...'' بڑی کاتیائن کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے ڈھیر ساری ''ماریجوانا'' پی لی ہو... اور وہ پوری طرح نشے میں آگئی ہو...

چھوٹی کاتیائن لیٹ گئی... اندھیرے میں جلتی ٹیوب لائٹ میں اس کا جسم چمکا... بڑی نے اسٹیل کی کٹوری تھام لی۔ اس کا سخت جھریوں بھرا ہاتھ گھی کے اندر گیا... جیسے کبھی میدے کی چھوٹی چھوٹی 'لوئیاں' بنتی ہیں اور انہیں ڈھیر سارے گھی میں ڈبویا جاتا ہے... گورے چٹے بدن پر بڑی کاتیائن گھی اس طرح ملنے لگیں گویا چھوٹی کا بدن اچانک میدے کی 'لوئیوں' میں تبدیل ہو گیا ہو... چھپ... چھپ...

''آہ، تم اب بھی ویسی ہو...'' بڑی کے ہاتھ میں حرکت ہوئی۔ ''بالکل ویسی... سنوریتا کاتیائن... دیکھو... خود کو دیکھو، غور سے۔ آہ... اپنی عمر کو دیکھو۔ نہیں، عمر کو مت دیکھو۔ مگر سنو۔ غور سے سنو۔ مرد اس تندور کو کب کا ٹھنڈا کر چکا ہوتا ہے، ایک لاش گھر کی طرح۔ مگر یہاں تم اپنے آپ کو

دیکھو۔ تم لاش گھر نہیں ہو، برف گھر بھی نہیں ہو، تم تندور ہو۔''

(کاتیائن بہنیں — مشرف عالم ذوقی)

کاتیائن بہنیں اپنے جسموں کے تندور میں جل رہی تھیں اور میرے سامنے سراپا جمال چندر مکھی اپنے بدن کی خوشبو بکھیر رہی تھی:

''وہ چندن کا لیپ جو میں نے تمہارے لیے ملا تھا، اس کی خوشبو ابھی تلک تمہارے لیے میرے شریر سے پھوٹ رہی ہے، میری بانہوں کا گوروچن ابھی تلک تمہارے لیے بے قرار ہے۔ میری آنکھوں میں ابھی تلک تمہارے لیے دیپک جل رہے ہیں۔ میرے ہونٹ ابھی تلک تمہارے لیے تمہارے ہونٹوں کی کونجن سے رسے ہوئے ہیں۔ میرے کیش ابھی تلک تمہارے لیے رات کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ میرے گال ابھی تلک تمہارے لیے الہاس سے دمک رہے ہیں... اور ان وستروں کے بھیتر جو شریر ہے، وہ ابھی تلک تمہارے لیے بھکشونی بنا ہوا ہے۔ اے میرے مسافر! میں اپنی کامناؤں اور سوندریہ کا بھکشا پاتر لیے تمہارے سامنے ہوں۔''

اور میں ڈرتے ڈرتے یہ کہہ رہا تھا......

''اے چندر مکھی... یہ تم اپنے وستر کیوں اتار رہی ہو؟ تمہاری کھلی ہوئی بانہہ اور تمہارے سینے کے کھلے ہوئے پنجرے کے دروازے سے مجھے ڈر لگ رہا ہے...''

مگر وہ بیقرار تھی اور اس کے بدن کا اضطراب سارے حجاب کو ہٹا رہا تھا:

''مت ڈرو میرے مسافر... تم میرے نکٹ آجاؤ اور مجھ میں لین ہو جاؤ۔ ولین ہونا کتنا ستیہ ہے... اور کیا تم نہیں جانتے کہ وستر تو ہمیشہ جھوٹ ہوتے ہیں۔''

اور پھر وہ سنانے لگی اپنی سندر داستان، بدن کی آگ کہانی:

''میں ایک سندر راجکماری تھی۔ بہت زمانہ بیتا میرا بدن، آگ کا ایک

سڈول لپکا تھا۔ بڑے بڑے عبادت گذار سادھو اس آگ میں اپنی کٹیا بناتے تھے اور خود کو محفوظ کر لیتے تھے۔ میرے بال کالے عظیم اور دور تک پھیلے ہوئے تھے جن کے اندھیروں میں سفید کشتیاں... ساتوں دریاؤں اور ناگوں سے بھری کشتیاں، رات کا گیت گاتی ہوئی، سرل اور صاف اجالوں کے چمبنوں والے مست اور اَن ڈے ساحلوں پر، بنا بھٹکے ہی، پہنچ جاتی تھیں...

میری آنکھیں دو چٹھیاں تھیں — چٹھیوں کے شبد پریم میں ڈوبی ہوئی دو سیاہ راتیں تھیں۔ سارا سنسار اُجالے میں ہوتا تھا اور میں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی سورج اور چاند تراشتی رہتی تھی... 'میرے ہونٹ دو بے چین چمبک تھے اور دل کی طرح دھڑکتے رہتے تھے۔ میں انہیں پریشان کیے ان کا دکھ جھیلتی رہتی تھی اور ان کا بنانے والا انہیں اوپر سے نہارتا رہتا تھا۔ وہ ان کے دھڑکنے سے کتنا سکھ پاتا تھا اور ان پر آسمانی صحیفے اُتارتا رہتا تھا... میری گردن شیشے کی بنی ہوئی ایک صراحی تھی۔ آسمان کی ساری اوس اس میں بھری رہتی تھی۔ زمین، بنا کھلے ہوئے مجھے کیسے کوستی رہتی تھی۔ میں اس کے دکھ سے کتنا سکھ پاتی تھی... اور سارے آسمانی صحیفے حفظ کر لیتی تھی...!

اور میری بھری بھری چھاتیاں دو خوبصورت ابابیلیں تھیں جن کے پاؤں میں دو بھورے چھلّے گھرے رہتے تھے۔ میں ان چھلّوں کو روز سجاتی اور سنوارتی تھی — کہ کبھی تو کوئی شہزادہ اُدھر سے گذرے گا اور میں اس کے لیے ان ابابیلوں کو چھلّوں سمیت اڑا دوں گی... اور ایک دن ایسا ہی ہوا، میرے شریر سے ایک شہزادے کا گذر ہوا۔ اس نے میرے بالوں کو دیکھا، اور اپنے بالوں کی ساری خوشبو میرے بالوں میں چھپا دی...

اس نے میرے ماتھے کو دیکھا... اور اپنے ماتھے کا سارا غرور میرے ماتھے پر بکھیر دیا...

اس نے میری آنکھوں کو دیکھا، اور اپنی آنکھوں کی ساری کالک میری آنکھوں پر مل دی... اس نے میرے ہونٹوں کو دیکھا، اور اپنے ہونٹوں کے سارے چمبن میرے ہونٹوں پر چبھو دیئے...

اس نے میری گردن کو دیکھا، اور اپنی گردن کی ساری یکتائی میری گردن میں سمو دی...

اس نے میری چھاتیوں کو دیکھا، اور انہیں اپنے سینے کے کسی تہہ خانے میں پھر سے اڑا دیا... آگے کیا ہوا مجھے نہیں معلوم— لیکن میں کتنی جلدی ماں بن گئی..." (ایک دن بیت گیا— صلاح الدین پرویز)

اس کے امرت سے بھرے مانسرو ور جیسے بدن دیکھ کر میں پورا بھیگ گیا تھا تو اس نے مجھے اور نکٹ بلایا بہت نکٹ، اور گلابی شربت کی ایک پیالی بڑھاتے ہوئے کہا:

"یہ شربتِ روح ہے۔ اسے پیتے ہی تم روح سے آزاد ہو جاؤ گے اور صرف ایک بھیگا ہوا بدن بن جاؤ گے... میں اپنے شعلوں سے تمہارا بھیگا ہوا بدن سکھا دوں گی۔" (ایک دن بیت گیا— صلاح الدین پرویز)

جب کئی یگوں پر محیط ایک دن بیت گیا تو میری رات نے انگڑائی لی اور پھر اس رات نے سارے درشیہ کو بدل دیا۔ میں نے جس ویران راستے سے اپنی یاترا شروع کی تھی، وہ راستہ اب بھرا پرا تھا اور جو نہر نظر آئی تھی، وہ معدوم ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک نالے کی نمود ہو گئی تھی اور اب وہاں ایک سایہ تھا جو ننگی لڑکیوں کی ننگی چھاتیوں، جانگھوں اور رانوں سے اٹھکھیلیاں کرتے پانیوں کے منظر سے محظوظ ہو رہا تھا......

لڑکیاں سر کے بل پانی میں ڈبکیاں لگاتیں تو ان کی ساڑی الٹ پڑتی اور آخری چھور تک ان کی ٹانگیں ننگی ہو جاتیں۔ بڑی، چھوٹی، بھری، پچکی، تنی، ڈھلی ہر طرح کی چھاتیاں اور جانگھوں تک کھلی موٹی، پتلی رانیں پوری طاقت کے ساتھ بالیشور کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ بالیشور کی نگاہیں پانی میں اچھلتے اور لہریں لیتے ہوئے آگ کے گولوں تک پہنچ کر سلگنے لگیں۔ مگر

ان کی چھاتیوں، ننگی ٹانگوں اور ٹانگوں کے آخری چھور پر رکھے انگاروں کا اثر ان مردوں پر نہیں تھا جو ان عورتوں کے ساتھ ہی پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ مردوں کے عریاں اعضا کا اثر بھی ان عورتوں کے کسی حصے پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بالیشور کے تخیل نے نالے میں ڈبکیاں لگانے والی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی جو اس کی ہم عمر تھی، جس کا جسم دوسرے جسموں کے مقابلے میں کچھ گداز تھا۔ جس کی چھاتیاں اٹھی ہوئی تھیں اور جس کی ناف گہری تھی۔ مگر نالے کے پانی نے جسے بھر دیا تھا، کو نالے سے نکال کر پھلواری کے پاس بہنے والی ندی میں ڈال دیا۔ اس ندی میں جس کے جل نے جوگیشور کے دانوی روپ کو انسانی شکلوں میں بدل دیا تھا۔ ندی کے شفاف پانی نے لڑکی کو اوپر سے نیچے تک دھو دیا۔ لہروں نے اسے گدگدا کر بیباک بنا دیا۔ ندی کی روانی نے اس کی رگوں میں خون کی رفتار کو تیز کر دیا۔ اس کا جسم دمک اٹھا۔ چہرے پر چمک آ گئی۔ آنکھیں روشنی سے بھر گئیں۔ ناف شفاف جھیل کی طرح جھلملانے لگی۔ چھاتیاں ڈھل کر پکی پیالیوں کی طرح سرخ اور چکنی لگنے لگیں۔ (دویہ بانی ـــ غضنفر)

اور پھر ایک اور منظر......

وہ جھینپتی ہوئی پیاز کے چھلکوں کی طرح اپنے کپڑے اُتارتی گئی۔ اندر سے سانولے رنگ کا کسا ہوا، چکنا اور متناسب جسم اُبھرتا گیا، جس کی مخصوص مہک سے میرا سارا وجود ملفوف ہو گیا...... اس کا سارا وجود شعلہ بار تھا۔

(چڑی کی بیگم ...... دیپک بدکی)

میں اس نشاط انگیز منظر میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک میں نے آنکھ کھول کر دیکھا، آسمان پہ سورج چمک رہا تھا اور زمین تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی... اور وہ نالہ نظروں سے غائب ہو گیا تھا۔ اس نالے سے ایک وجود ابھر رہا تھا، انتہائی بھیانک وجود۔ میں

دیکھ کے ڈرا اور پوچھا کون؟ تو وہ گویا ہوا......

''میں ابو درویش — یہ میرا سیال وجود ہے۔ ادھر دیکھو شجر حجر کی طرف وہ میرا جلمود وجود ہے۔ میں اپنے وجود کی ماہیت بدلتا رہتا ہوں اور ماہیت کے ساتھ اپنا مستقر بھی۔''

پھر ثانیے بھر میں وہ غائب ہو گیا اور اس کے وجود سے جمال کی نت نئی کرنیں پھوٹ پڑیں اور ان کرنوں میں بہت سارے مقامات منکشف ہو گئے جنہیں ابھی طے کرنا باقی تھا...

مجھے ایک اور انت ہین یاترا کے لیے تیار ہونا تھا —

○○

۲

میں شہر نگاراں میں تھا اور دیکھ رہا تھا قیامت قدوں کی شوخیٔ رفتار اور گل پیرہن کے غنچہ گل دہن کو کہ میری آنکھ لگ گئی اور پھر میں نے خواب میں دیکھا......

''ایک ہیولیٰ سولہ ہزار حسیناؤں کا، بتیس ہزار استنوں کے ساتھ رقص کر رہا ہے اور سبھی کی استنیں کبھی آگ اور کبھی شبنم میں تبدیل ہوتی جارہی ہیں۔ ہر طرف استنیں ہی استنیں۔ استنوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں ایک استن میں شرن لیتا ہوں تو میرے اندر زرخیزی کی قوتیں بڑھنے لگتی ہیں، پھر دیکھتا ہوں کہ میرے چاروں طرف مستی میں شرابور خود آگاہ شفاف بدن نمودار ہوگئے ہیں اور وہ سب بھرت ناٹیم رقص کر رہے ہیں۔ ان کے جسموں کے جذباتی تموج میں ہیولیٰ سے وصال کی آرزو موجزن ہے۔ یہ ساری حسینائیں، دلربائیں ایسے پھول کی طرح لگ رہی ہیں جسے کبھی سونگھا نہیں گیا۔ ایسی پتی کی طرح لگ رہی ہیں جسے ہاتھ سے توڑا نہیں گیا۔ اُس موتی کی طرح لگ رہی ہیں جسے کسی ہار میں پرویا نہیں گیا اور شہد کی طرح لگ رہی ہیں جسے چکھا نہیں گیا۔''

میرا خواب ڈزالو ہوا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک ایسے مکان میں ہوں جس کے آنگن سندر ناریوں کے پاؤں کی مہندی سے لال لال ہوگئے تھے اور پھر ایک گیانی نے مجھے بتایا کہ وہ استنیں نہیں، تخلیق کا آکار تھیں، تخلیق کی لہریں تھیں...

میں انہیں دیکھ دشائیں بھول گیا تھا اور پھر سپنوں کے راستے پر چلتے ہوئے اوس کی بوندوں سے باتیں کرتی ہوئی اُس بت طناز کے خیال میں بہت دیر تک محو رہا۔

نرمل جل سے نہا کے وہ اور کومل ہوگئی تھی۔ اس کے روپ کا کنوارا پن قابل دید تھا۔ وہ بالکل ستیہ وتی، کنتی اور مادھوی جیسی جاوداں دوشیزگی والی لگ رہی تھی۔ اس کی دوشیزہ نگاہی نے دل کو ویدھ دیا تھا۔ وہ نگاہ نہیں کوئی اگنی بان تھی جو سیدھے میرے دل پہ آ کے لگی تھی۔

اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ مالویکا کے جسم کی جنبشوں میں پوری کائنات ٹھہر گئی۔ راجہ کے سامنے جب مٹھی بھر کمر، چکنے ملائم کولہے، ابھرے کچوں سے تنی چھاتی کے ساتھ بڑی بڑی آنکھوں والی، شرد کے چاند سا چہرہ، 'چھلک نرتیہ' دکھا رہی تھی تو راجہ کی آنکھیں اس جسم کے بھاؤ پر رک سی گئی تھیں۔ مالویکا کے رقص سے راجہ بسمل ہوگیا تھا۔ حسین کولہے پر بایاں ہاتھ رکھے مالویکا غضب ڈھا رہی تھی۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس مالویکا کے بھاری بھرکم کولہوں، کسیلے پستانوں، پتلی کمر اور بڑی بڑی آنکھوں کو جب راجہ نے دیکھا تو اس کی سندرتا میں ایک بار پھر کھوگیا۔ سرخ کنول کی طرح مہاور سے رنگے ہوئے پاؤں اور پاؤں کے بچھوے غضب ڈھا رہے تھے۔ اس کی انگلی میں ناگ مدرا جڑی ہوئی ایک انگوٹھی بھی تھی اور راجہ امر بیل کی طرح مالویکا سے لپٹا ہوا تھا۔ اس وقت مالویکا چیت ماہ کی رات کی طرح کہرے سے نکلنے والے ماہتاب کی مانند لگ رہی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر ایسا لگا جیسے راجہ بھرتری ہری کے 'شرنگار شتک' کے کئی اوراق ایک ساتھ پلٹ گئے ہوں اور وہ حسن کے نئے نئے جلووں سے سرشار کر رہے ہوں۔ اچانک دیکھا ایک چندر ما مثال کی چھاتیوں میں ہاتھیوں کا سا جلال، اس کامنی کے بدن کا حسن و جمال، اس کی سڈول جانگھیں، چنچل آنکھیں، کوئی اس کنچن بدن کے ہونٹوں پہ بوسہ زن ہے تو کوئی سینے پہ مشت زن اور اُدھر دور کہیں کوئی سر کوہسار کی سیر میں مست ہے اور کوئی چھاتیوں کے ابھار میں ترنگ مچا رہا ہے اور دور کھڑی ایک پیر زن حسرت وصل کی آگ میں سلگ رہی ہے اور بسنتی ہوائیں چولیوں سے سینہ زوری کرتی، چھاتیاں گدگداتی گزر رہی ہیں۔

میں کس سمت سفر میں تھا، مجھے کچھ پتہ نہیں۔ پھر ایک دم خیال آیا اور سوچا

کہ بیتال چمپا پور کی رانی سلوچنا کو بھی دیکھتا چلوں جس کے حسن کا بڑا شہرہ سنا ہے۔ کہتے ہیں کہ......

''اس کا مکھ چندرما سا، بال گھٹا سے، آنکھیں مرگ سی، بھوں دھنش جیسی، ناک تیر کی سی، گلا کپوت کا سا، دانت انار کے دانے سے، ہونٹوں کی لالی کندورکی سی، کمر چیتے کی سی، ہاتھ پاؤں کومل کومل سے اور رنگ چمپے کا سا۔''

(بیتال پچیسی کی چوتھی کہانی)

اور پھر کچھ دور آگے رتن دت سیٹھ کی لڑکی کے حسن پر نگاہ ٹھہر گئی اور آنکھ یہ دیکھ کر خیرہ رہ گئی کہ......

''آنکھیں مرگ جیسی، چوٹی ناگن جیسی، بھویں کمان کی سی، ناک تیر کی سی، بتیسی موتی کی لڑی، ہونٹ کنول کے سے۔ وہ چندر مکھی، چمک بدنی، ہنس لسنی اور کوکل بینی تھی۔'' (بیتال پچیسی کی سولہویں کہانی)

میں ملکہ مہر نگار کے بزم نشاط میں بھی گیا، زربفت کے لہنگے اور شبنم کے دوپٹے میں ملبوس وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جام بلوریں تھا اور پیالہ بادہ ارغوانی سے لبریز تھا۔ اس کی مخمور آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

کچھ دور آگے بڑھا ہی تھا کہ گل برگ تر کی صورت، میری آنکھوں کے سامنے پدم جیسا خوشبو دار بدن نمودار ہوا جس کا رنگ کمد کے پھول جیسا تھا۔ مہادیو کے مندر میں جب وہ چھتیس قوم کی عورتوں کے ساتھ پہنچی تو دیوتا بھی اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر غش کھا کے جاں بحق ہو گئے۔ اور پھر......

''ناگاہ ایک جھروکا اس مکان کا کھلا، دیکھا اوپر چہرہ نازنیں کہ رخسار اس کے مانند لالہ احمر کے رنگین اور چشم مردم فریب اس کی غیرت آہوئے چین، زلف عنبر فام اس کی سنبل گلستان جمال اور جعد مسلسل دل آشفتگان محبت کے جی کا جنجال، ایک تخت مرصع زرنگار پر بیٹھی سر نکالے، تک رہی ہے، نظر پڑی اور اس کے جمال کی روشنی سے سارا باغ منور ہے اور اس کے بدن کی

خوشبو سے دماغ روحانیاں معطر — اور قریب ہی ایک خوش جمال، خجستہ خصال کہ جس کے مکھڑے کے سامنے آفتاب بیتاب اور دل ماہ اس کے نظارے سے کباب، لب شیریں اس کے لعل رمانی اور گلبرگ بستانی پر خندہ زن، ایک بوسہ اس کا علاج ہزار رنج و محن، آنکھیں شراب مستی سرشار، رخساروں کی لطافت گل ونسرین کی بہار۔'' (قصہ گل وصنوبر)

ویری ناگ کے نیلگوں پانی میں نہانے کے بعد جب میرا باطن پوری طرح منزہ اور مطہر ہوگیا، کسی قسم کی کوئی کثافت، آلودگی میرے وجود سے لپٹی نہ رہی تو دیکھا چہار سو چشمے پھوٹ پڑے ہیں۔ اچانک میرے خواب اور خیال نے جست لگائی اور میں اس لہرتارا کے تالاب پر پہنچ گیا۔ جہاں کبیر، اپنی زندگی کے اس لمحے کو یاد کرنے میں مصروف تھا جب اس کی ماں نے بے یارو مددگار اس تالاب کے پاس لا کر چھوڑ دیا تھا۔ وہیں کبیر نے مجھ سے جو بانی کی، وہ بیان کرتا ہوں......

چندا جھلکے یہ گھٹ ماہی   اندھی آنکھن سوجت ناہیں
یہ گھٹ چندا یہ گھٹ سور   یہ گھٹ گاجے انہد تور
یہ گھٹ باجے طبل نشان   بہرا شبد سنے نہ کان

''اس جسم میں چاند چمکتا ہے، لیکن اندھی آنکھوں کو کیا سوجھے۔ اس جسم میں چاند ہے اسی میں سورج۔ اسی جسم میں لافانی انہد کی تر ہی بجتی ہے۔ اسی جسم میں طبل اور نقارے بجتے ہیں۔ لیکن بہرے کو ایک آواز بھی نہیں آتی۔

یا گھٹ بھیتر سات سمندر یاہ میں ندی نارا
یا گھٹ بھیتر کاشی دوارکا یاہ میں ٹھاکر دوارا
یا گھٹ بھیتر چند سور رہے یاہ میں نو لکھ تارا
کہے کبیر سنو بھئی سادھو یاہ میں ست کرتارا

''اس جسم کے اندر سات سمندر ہیں، اس میں ندی نالے ہیں۔ اسی جسم میں

کاشی اور دوارکا ہیں، اسی میں ٹھاکر دوارا ہے، اسی جسم میں چاند اور سورج ہیں۔ اسی میں نو لاکھ ستارے ہیں۔''

کبیر کی یہ بانی دل میں اتر گئی اور میں آگے بڑھا تو ایک باغ میں پہنچا جہاں درخت کی شاخوں سے خوشبوئیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ دیکھا کہ گل مہر، ہار سنگار، اشوک، املتاش پہ بہار آئی ہوئی ہے، چنبیلی کھلی ہوئی ہے، اس موسم جمال و وصال میں کیسے کیسے خیال آئے اور اس بسنت رُت میں آم منجری کو دیکھ کر پورے جسم میں ایک عجیب سی نشاط آگیں کیفیت محسوس ہوئی۔ جمال کی رعنائیوں کے اس موسم میں شبنمی گھاس پہ دو پیکر یخ بستہ ملے تو خیال آیا کہ جسم اور جمال کے اندر جذب و انجذاب کی کتنی کیفیت ہوتی ہے اور یہ جسم ہی زندگی ہے اور زندگی کی حقیقت بھی اور اسی جسم کے جمال پر کائنات ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ دونوں پیکر مجھے کائنات کے دو دُھر لگے جس پہ یہ یونیورس ٹھہری ہوئی ہے۔

پھر باغ سے کچھ دور پہنچا تو دیکھا کہ ہوائیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ پانی کی ایک لہر دوسری لہر سے متصادم ہے۔ کچھ عجیب خوفناک آوازوں کا شور ہے۔ اس شور سے ایک پیکر ابھرا۔ اس تخلیق تمثال کو دیکھ کر میری حیرانی بڑھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ تخلیق 'دروپدی' میں مجسم ہونے لگی اور اس کے اطراف و جوانب عجیب و غریب بھیانک شکلوں والے منڈرانے لگے۔ وہ سب دروپدی کے وستر ہنن کے لیے آگے بڑھنے ہی والے تھے کہ ایک بلند بانگ آواز بلند ہوئی......

اس قیامت قد کو شب دیکھا تھا ہم نے خواب میں
دل نے محشر کا سماں وقت سحر دکھلا دیا

رُکو، اس کو شکستہ مت کرو۔ اس کے اندر چھپے ہوئے حسن کے مظاہر اور جمالیاتی نقوش کو اپنے شعور اور تخیل کا حصہ بناؤ، اسی کا حسن و جمال تمہاری قوت تخیل کو جلا عطا کرتا ہے۔ اس کے حسن کو مجروح مت کرو۔ اپنے ناجائز لمس سے اس کے پاکیزہ جمالیاتی وجود کو نجس نہ کرو۔ اس کی گہرائی میں اتر کر دیکھو۔ اس کے باطن کا جمال جب تم پہ منکشف

ہوگا تب تم اس کے قریب وقرین ہو سکتے ہو۔

تخلیق تمثال دروپدی کے 'محرم' کی شکستگی دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا۔ دروپدیٔ سہمی سہمی ڈری ڈری ایک گوشے میں خود کو بچانے کی ناتواں کوشش کر رہی تھی اور وہ چیخ چلا کر کہہ رہی تھی کہ مجھے نہ آگ جلا سکتی ہے نہ پانی گیلا کر سکتا ہے، نہ ہوا سکھا سکتی ہے۔ میں امر جیو آتما ہوں۔ میں جل میں رس ہوں، چندر ما اور سورج میں پرکاش۔ آکاش میں شبد۔ پرتھوی میں پوتر گندھ اور آگ میں تیج۔

میرے پربھاؤ اور یوگ شکتی کو دیکھ پانے کی شکتی تم لوگوں کے نیتروں میں نہیں ہے۔ تم میرے اندر اترو اور پھر میرا ایشوریہ یکت روپ دیکھو گے تو پھر میرا وستر ہرن نہیں کرو گے۔ میرے باطن کی تہوں میں اتر کر ہی تم پرم پرش بن سکتے ہو اور تبھی تمہیں پرم شانتی اور پرم گتی مل سکتی ہے۔ مگر میں جانتی ہوں تم سب نیتر ہین ہو... دھرت راشٹر، تم سب انتظار کرو... سنجے کا... انتظار... انتظار... انتظار...

...اور پھر پورنیما کی ایک رات میں دروپدی پریاگ کی تروینی میں نظر آئی۔ اس کا آدھا جسم بھیگ رہا تھا، آدھا جسم جل رہا تھا۔ اس نے ایکانت میں مجھے اپنے نکٹ بلایا بہت ہی نکٹ، اور پھر اپنے سینۂ سوزاں سے کچھ پرشٹھ نکال کر یہ کہتے ہوئے میرے حوالے کئے کہ یہ ایک حسین پری کی امانت ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ انہیں اپنے سینے سے سدا سجا کر رکھنا تاکہ تمہارا سینہ ہمیشہ منور اور معطر رہے۔ کئی یگوں سے یہ پرشٹھ میرے سینے میں سجے ہوئے ہیں اور تبھی سے میرا آدھا جسم پانی کے اندر ہے اور آدھا پانی سے باہر۔ میں اس رمز کو آج تک سمجھ نہیں پائی۔ شاید تم سمجھ سکو۔ لو یہ پرشٹھ... انہیں شیتل چاندنی رات میں ہی پڑھنا۔ اس رات ضرور پری تمہارے پاس آئے گی اور اس رمز کو آشکار کرے گی۔ جب شیتل چاندنی رات آئی تو میں نے وہ پرشٹھ کھولے... دیکھا کہ سارے شبد غائب تھے اور شبدوں کی جگہ سوسن اور گلاب مہک رہے تھے۔ یہ سارا معاملہ تحیر کا تھا کہ اسی لمحہ تحیر میں خوبرو پری نمودار ہوئی۔ پرشٹھ کو اپنے نازک ہونٹوں کا لمس دیا... سارے شبد زندہ ہو گئے۔ تب پری نے جاتے جاتے میرے کان میں سرگوشی کی کہ

یہ پرشٹھ میرے نہیں، دروپدی کے ہیں جو اس نے کئی یگوں سے اپنے سینے میں سجا کر رکھے تھے۔ میں نے وہ پرشٹھ کھولے تو کئی سمندر سطریں میری آنکھوں میں تیرنے لگیں۔ اِن سطروں کی دوشیزگی میرے پورے وجود میں یوں اترنے لگی......

کس لیے کم نہیں ہے درد فراق
اب تو وہ دھیان سے اتر بھی گئے

تم مخاطب بھی ہو، قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں گزرے ہوں یا تجھے بھلانے میں

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزل جاناں پہ آنکھ بھر آئی

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات، رات ہوئی

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

اب دور آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

فراقؔ کی شاعری میں انسانی تہذیب کی صدیاں بولتی ہیں۔ وہ انگریزی کے رومانی شاعروں ورڈز ورتھ، شیلی، کیٹس سے متاثر تھے تو دوسری طرف سنسکرت کا ویہ روایت کا بھی ان کے نظریۂ جمال پر گہرا اثر تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ شاعر کے نغمے وہ ہاتھ ہیں جو رہ رہ کر آفاق کے مندر کی گھنٹیاں بجاتے ہیں۔ فراقؔ کے بنیادی موضوعات: حسن و عشق، انسانی تعلقات کی دھوپ چھاؤں، فطرت اور جمالیات، ہیں۔ وہ جذبات کی تھرتھراہٹوں، جسم و جمال کی لطافتوں اور نشاط و درد کی ہلکی کیفیتوں کے شاعر تھے۔ ''روپ'' کی رباعیوں میں سنسکرت کے سنگھار رس اور ہندی کی ریتی کال کی شاعری کا اثر ہے۔ گھریلو محبت کے ایسے مرقعے اس سے پہلے اردو شاعری میں نہ تھے۔ ان میں ہندوستانی عورت جسم و جمال کی تمام دلآویزیوں کے ساتھ اور گھر پریوار تمام لطافتوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ عورت کا کنوارا پن، بیاہتا بیوی کا سگھڑاپا، ماں کا پیار دلار سب ان رباعیوں میں طرح طرح سے بیان ہوا ہے۔ ان میں ممتا کی کسک بھی ہے اور جسم و جمال کی رنگینیوں سے آباد آنند بھری کیفیتیں بھی......

دوشیزہ فضا میں لہلہایا ہوا روپ
آئینۂ صبح میں چھلکتا ہوا روپ

یہ نرم نکھار، یہ سجل دھج، یہ سگندھ
رس میں کنوارے پن کے ڈوبا ہوا روپ
ہر جلوے سے اک درس نمو لیتا ہوں
چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جان بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں
آنسو بھرے بھرے وہ نینا رس کے
ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات یہ برہا کی پیڑا
جس طرح الٹ گئی ہو ناگن ڈس کے
موتی کی کان رس کا ساگر ہے بدن
درپن آکاش کا سراسر ہے بدن
انگڑائی میں راج ہنس تولے ہوئے پَر
یا دُودھ بھرا مانسرور ہے بدن

(فراقؔ گورکھپوری)

دوسرا پرشٹھ کھولا تو سنگیت کے سُر بجنے لگے اور اُن سروں میں یہ سطریں بھی سما گئیں......

آن ملو آن ملو شیام سانورے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی کھوئی سی رے
برندابن کی کنج گلین میں تم بن جیارا نہ لاگے
نس دن تمہاری باٹ نہاریں بیاکل نین ابھاگے
اب ہی ایسی دشا ہے من کی کیا ہوئی ہے پھر آگے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی کھوئی سی رے

آج لگا ہے جمنا تیرے مُرلی مدھر بجائی
آج لگا ہے سکھین کے سنگ ہل ہل راس رچائی
ہمرا آنگن چھوڑ کے تو ہے کون نگریا بھائی
برج میں اکیلی رادھے کھوئی کھوئی سی رے
رجھوں جو نہ بھیجی موہن تیئں نے کھوئی کھبریا
ہو جیسے اک برج بالا رو رو کر باوریا
دھیر بندھا جا مکھ دکھلا جانٹ ناگر سانوریا رے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی کھوئی سی رے
آن ملو آن ملو شیام سانورے

......بھجن کے بول برج بھاشا اور راجستھان کے لہجے میں نہائے ہوئے ہیں۔ سوسیر کا کلیدی قول ہے کہ آج تک کسی نے کوئی سگنیفائڈ بغیر سگنیفائر کے نہیں دیکھا۔ معنیات جو بھی قائم ہوتی ہے بغیر نشان، یعنی سائن کے نہیں۔ شیام سانورے، برج میں اکیلی رادھے، براندابن کی کنج گلین، باٹ نہاریں نین ابھاگے، جمنا تیرے مُرلی مدھر بجائی، راس رچائی، یا نٹ ناگر سانوریا رے، میں کسی نشان کو بدل دیجیے، ساری معنیاتی فضا بدل جائے گی، بول تو شاید رہ جائیں، بھجن نہیں رہے گا۔ ساحر کی ساحری اسی میں ہے کہ اس نے بھجن کی لفظیات کا اس خوبی سے صرف کیا ہے کہ کرشن اور بیاکل گوپیوں کی راس لیلا سے شردھا، عقیدت اور سرشاری کی جو توقعات وابستہ ہیں وہ پورے جمالیاتی کیف وکم کے ساتھ پوری ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ہندوستان میں بھگتی کے دو دھارے معلوم ہیں، کرشن بھگتی اور رام بھگتی۔ دونوں کی بنیاد عشق ومحبت، جذبات کی سرشاری اور تجسیمیت پر ہے۔ لیکن کرشن کی راس جہاں رومان پروری اور رنگینی وحسن کاری کا پہلو رکھتی ہے،

رام کی روایت میں ایثار و قربانی، فرض شناسی اور وفاشعاری کی صفات نمایاں ہیں۔ ساحر نے دونوں طرح کے بھجن کہے ہیں لیکن رومانی افتاد ذہنی کی وجہ سے ساحر کو زیادہ مناسبت کرشن جی کی معنویت رکھنے والے بھجنوں سے ہے۔ بنگال کے سوامی چیتنیہ کی روایت میں کرشن کا تصور پربھو کے طور پر کیا گیا ہے۔ نیچے کا بھجن خالص کرشن بھگتی کا بھجن ہے۔ دیگر تمام ہندوستانی بھاشائی شاعری کی طرح اس کی خصوصیت خاصہ بھی اس کا برہن کی زبان سے کلام ہونا ہے جو محبت میں چور ہجر و فراق کی اس حد تک ماری ہوتی ہے کہ برہا کی پیڑا اور دیہہ کی اگنی نے تن من کو جلا کر رکھ دیا ہے۔ بن پریتم گھر آنگن سونا ہے۔ جیون کنگنا مرجھا رہا ہے۔ پیار کے دو بول سنائی دیں تو جیون دھن مل جائے اور پھر سے آس بندھ جائے۔ اس تناظر میں میرا بائی کی روح صاف جھلکتی ہے اور بولوں میں بھی کچھ ٹکڑے اس پریم دیوانی کے درد اور اضطراب کے بھی آ گئے ہیں......

پربھو تیرو نام، جو دھیائے پھل پائے، سکھ لائے تیرو نام
پربھو تیرو نام
تیری دیا ہو جائے تو داتا، جیون دھن مل جائے
سکھ لائے تیرو نام، جو دھیائے تیرو نام
پربھو تیرو نام
تو دانی تو انتریامی، تیری کرپا ہو جائے تو سوامی
ہر بگڑی بن جائے، جیون دھن مل جائے
سکھ لائے تیرو نام، جو دھیائے تیرو نام
پربھو تیرو نام
بس جائے مورا سونا انگنا، کھل جائے مرجھایا کنگنا
جیون میں رس لائے، جیون دھن مل جائے

سکھ لائے تیرو نام، جو دھیائے پھل پائے
سکھ لائے تیرو نام، پربھو تیرو نام

ان بھجنوں میں کرشن کا براہ راست ورنن نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ کس سچویشن کے لیے ان کو لکھا گیا ہوگا، نہ ہی ہم کو کسی سچویشن سے سروکار ہے۔ کیونکہ دوسرے ذرائع سے پیدا کی گئی معنویت سے یہاں غرض نہیں، غرض ہے تو اس معنویت سے جو متن سے متعلق ہے اور لطافت و کیفیت یا اثر آفرینی جو کچھ ہے، اس کی قبولیت کی راہ متن کے نظام نشانات کی رو سے ہے۔ پہلے دو بھجنوں کی طرح اس میں بھی مقبول عام بولوں سے کام لیا گیا ہے اور اصل فضا امیجری سے ابھاری گئی ہے۔ پچھلے بھجن کی مرکزیت گیان دھیان (جو دھیایے پھل پائے) اور نام کے جاپ (پربھو تیرو نام، سکھ لائے تیرو نام) سے تھی، جب کہ زیر بحث بھجن کا مرکزی نشان اندر کی آگ، جدائی، تپش اور پیاس کا ہے، یعنی بانہہ پکڑنے، انگ لگانے اور شیتل ہوجانے کا ہے۔ ہردے کی پیڑا/ دیہہ کی اگنی/کیسی جاگی یہ اگن/ جیادھیر دھرن نہیں پائے/ یا/ اتنی برسادو/ سے اشارہ پریم سدھا کی طرف ہے۔ جنم جنم کی داسی انتر گھٹ تک پیاسی ہے۔ پریم سدھا کی ورشا ہوتو تن من سب جل تھل ہوجائے اور وجود جو ظاہر بھی ہے اور باطن بھی سب شیتل ہوجائے......

آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہوجائے
ہردے کی پیڑا دیہہ کی اگنی سب شیتل ہوجائے
کیے لاکھ جتن مورے من کی تپن مورے تن کی جلن نہیں جائے
کیسی لاگی یہ لگن کیسی جاگی یہ اگن جیادھیر دھرن نہیں پائے
پریم سدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہوجائے
آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہوجائے

موہے اپنا بنالو موری بانہہ پکڑ میں ہوں جنم جنم کی داسی
موری پیاس بجھا دو، من ہر گردھر میں ہوں انتر گھٹ تک پیاسی
پریم سدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہوجائے
آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہوجائے

......تجسیم تجسیم ہے اور تجرید تجرید، لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ اس کا جیسا راز بھجن میں کھلتا ہے دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ عشق وادات، عقیدت و محبت، ٹوٹ کر چاہنے، عشق کی آگ میں اندر ہی اندر جلنے، انگ میں انگ سمانے اور جنم جنم کی پیاس بجھانے اور جل تھل ہوجانے کا تصور خاصی جاندار مجازی کیفیت رکھتا ہے۔ یہ جسم و جمال کی سرشاری اور بدنیت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ وہ روحانیت ہے جو مندروں کی جسمانیت سے اُبھرتی ہے۔ ذہنی خیال لاکھ حقیقی سہی، جذبے کو فتیلہ دکھانے کے لیے تجریدیت سے کام نہیں نکلتا۔ تجسیمات کی تہ داری ضروری ہے۔ بھگتی کی سرشاری اور جذب و کیف کا سب سے بڑا رمز یہی ہے کہ اس میں پُرش اور پرکرتی ایک ہی سطح پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔''

تیسرا پرشٹھ کھولا تو وہ بالکل کورا تھا۔ چوتھے پانچویں اور چھٹے پرشٹھ پر کچھ مبہم نقطوں کے نقوش تھے۔ ساتویں پرشٹھ پر برنداون، متھرا اور آگرہ کے نقشے سے جھانکتی ہوئی کچھ رنگ برنگی تصویریں نظر آرہی تھیں جو چھوٹے چھوٹے نیم کلموں اور مفرد لفظوں سے بنائی گئی تھیں، اس میں سے ایک سراپا یوں جھانک رہا تھا......

سراپا حسن سمدھن گویا گلشن کی کیاری ہے
پری بھی اب تو بازی حسن میں سمدھن سے ہاری ہے
کھنچی کنگھی گندھی چوٹی جمی پٹی لگا کاجل
کمان ابرو نظر جادو نگہ ہر اک دلاری ہے

جبیں مہتاب آنکھیں شوخ شیریں لب گہر دنداں
بدن موتی دہن غنچہ ادا ہنسنے کی پیاری ہے
نیا کم خواب کا لہنگا جھمکتے تاش کی انگیا
کچیں تصویر سی جن پر لگا گوٹہ کناری ہے
سریں نازک کمر پتلی خط گل زار روما دل
کہوں کیا آگے اب اس کے مقامِ پردہ داری ہے
لٹکتی چال مدھماتی چلے بچھو کو جھنکاتی!
ادا میں دل لیے جاتی عجب سمدھن ہماری ہے

بھرے جوبن پہ اتراتی جھمک انگیا کی دکھلاتی!
کمر لہنگے سے بل کھاتی لٹک گھونگھٹ کی بھاری ہے

... یہ تصویر اس آدمی نے بنائی تھی جو ''پورے جسم سے سوچتا ہے اور جس کے تخیل کی گوپیاں جمنا کنارے کی فضاؤں میں ہمیشہ نظروں میں بسی رہیں اور جسم و جمال کی لطافتوں کی کلیاں کھلاتی رہیں۔ راس کی کیفیت میں ڈوبا ہوا یہ بنجارہ آدمی تھا جو حسن کا رسیا تھا۔ جسم و جمال کی اداؤں اور گھاتوں کی تعریف و تحسین پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ حواس کی سرشاری اور کسب لذت کی منزلوں کی بھی خبر دیتا ہے۔ اس کے لیے ہر حور وش پری چہرہ گوپی تھی اور وہ خود رنگ رنگ میں کھویا ہوا کنہیا، تہذیبی دید باز نظیر اکبرآبادی''

ان پرشٹھوں کو پڑھ کر ایسا لگا جیسے پرم بھوگ پراپت ہوگیا ہو اور آنند اور وِمرش کی منزل مل گئی ہو۔ میں یہ سارے پرشٹھ پڑھ چکا تو پری پھر نمودار ہوئی۔ اس نے کہا یہ پرشٹھ ننجے کے دیے ہوئے ہیں اور یہ ننجے کون ہے؟... یہ میں نہیں بتاؤں گی۔ یہ تم دروپدی سے ہی پوچھنا، وہی بہتر بتا سکتی ہے... پھر ایک رات جب چاندنی چاروں سمت پھیلی ہوئی تھی، دروپدی نے تخلیے میں مجھ سے کہا کہ میں کہ ایک تخلیق تمثال ہوں۔

میرے وجود میں اس نے جذب ہوکر مجھے دریافت کیا ہے۔ سچ کہوں تو اس میں شِو کی شکتی ہے اور زرخیزی بھی۔ بس اسی لیے میں نے اپنے پریتم کے پرشٹھ اپنے سینے میں کئی یگوں سے سجا کے رکھے تھے۔ ان پرشٹھوں میں میرا صحیح ورنن بھی ہے اور آنکلن بھی۔ مگر میں تمہیں اس کا اصلی نام نہیں بتاؤں گی کہ حیا آتی ہے... پھر وہ دانتوں تلے انگلی دباتے ہوئے نکل پڑی۔ جب دور بہت دور پہنچ گئی میں اس کے خیالوں کے سحر سے جاگا اور اس کے نقشِ پا کو تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تو دیکھا کہ ریت پر جگہ جگہ حنائی نقرئی انگلیوں سے ایک ہی نام کھدا ہوا ہے بس ایک ہی نام — گوپی چند نارنگ — تبھی کسی نے میرے شانے تھپتھپائے اور کہا جمالیاتی تفاعل اور اس کی معنویتوں کو تلاش کرنا بڑا جوکھم کا کام ہے۔ تخلیق تو معشوق کی طرح جلوۂ صدرنگ رکھتی ہے۔ اس کی اشارت، عبارت، نزاکت اور ادا کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور جو سمجھ لے وہی سب سے بڑا گیانی ہے۔ تخلیق شناسی اور ادبی جمال کا عرفان و ادراک بہت سارے مسالک و منازل سے گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے تنقید میں وہ سارے منازل طے کرلیے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں تخلیق اور تنقید کی دوئی ختم ہوگئی اور دونوں ایک جان دو قالب ہوگئے ہیں۔ ''من تو شدم، تو من شدی'' والی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

دراصل تخلیق اور تنقید میں وہی رشتہ ہوتا ہے جو پاروتی اور شِو میں ہے، جو عاشق اور معشوق میں ہے، جو شمع اور پروانے میں ہے... باکیف تخلیق ہی پُر جمال اور لذت آشنا تنقید کا محرک ہوتی ہے۔ نارنگ صاحب کی تنقید، تخلیق میں اس قدر جذب ہوگئی ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بہت مشکل ہے۔ انہوں نے تخلیق کے شوخ سجل بدن کی لچک کو اپنے اندر سمولیا ہے اور اسے ایک نئی ہوش ربا رمزکاری عطا کی ہے۔ اس لیے ان کی تنقید میں جمال کی دوشیزگی بھی ہے اور وصال کی پُرکیف نشاط انگیز ، سکر آمیز کیفیت بھی...

......اور پھر میں نے دیکھا کہ موجوں کے سفید جھاگ سے ایک پیکر اُبھر رہا ہے۔ انتہائی حسین وجمیل۔ پیکر کے پاؤں جہاں جہاں پڑ رہے ہیں، وہاں پھول کھلے جاتے ہیں۔ دو کبوتروں کے ذریعے کھینچے جانے والے رتھ پر سوار پیکر جب آگے بڑھتا ہے تو اس کے حسن کو دیکھ کر اہل سموات پر سکر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آسمان نے ایسا جمال نہ کبھی دیکھا اور نہ ایسا ملکوتی حسن۔ زمین کے ذرے ذرے میں یہ پیکر اپنی کرنیں پھیلانے لگا اور جب اس کے حسن کی جمال کرنیں زمیں پہ پڑیں تو اہل زمیں بھی مدہوش ہو گئے...

زمین و آسمان کو مدہوش کرنے والے اس حسن نظارہ سوز کا نام تھا افرودیت اوینوس... جس کے حسن نے ہیر اور ایتھنز جیسی حسیناؤں کے سرخ چہروں پر سیاہی کی ہلکی لکیر پھیلا دی تھی۔ رقابت کی آگ میں حسن جلنے لگے۔ بالآخر ریوڑ چلانے والے پیرس نے افرودیت کو ملکہ حسن قرار دیا۔ لیکن ایک دن جب افرودیت نے نو بہار ناز بسیشہ کو دیکھا تو اپنا حسن ماند نظر آنے لگا۔ اس کے اندر حسد کی آگ جلنے لگی۔ بسیشہ ایک حسین ترین دوشیزہ تھی جس کی مدھ بھری آنکھوں میں پوری کائنات کو مسخر کرنے والا جادو تھا اور اس کے حسن جاں سوز جمال دلفروز پر افرودیت کا بیٹا ایروس عاشق تھا۔ وہ ہر رات تاریکی میں اس سے ملنے جاتا۔ بسیشہ اس کے دیدار کی تمنا لیے رہتی مگر دیکھ نہ پاتی۔ بالآخر ایک ترکیب سوچی اور پھر ایک رات جب اس نے چاند کی طرح حسین دلکش چہرہ دیکھا جس کی سانسوں میں شراب کی مستی تھی تو وہ بوسے کے لیے جھکی اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور یہی لمحہ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ سراپا التہاب اور سوز فراق بن گئی...

ہر درد سہا، ہر مصیبت برداشت کی، دیوتاؤں سے رحم کی طلب گار ہوئی اور پھر یوں ہوا کہ بچھڑا ہوا محبوب مل گیا اور بسیشہ ایروس کی آنکھوں کا چاند بن گئی۔

یہ بدن کی مقناطیسی کشش تھی، یہ بدن کے جمال کا جادو تھا، بدن جس میں حیاتیاتی کیمیائی اثر ہوتا ہے۔ یہی بدن جب ملتے ہیں تو سرخ پھول کھلتے ہیں۔ کائنات کے ہر ذرے میں بدن کا جمال ہی پوشیدہ ہے۔ خوبصورت پاؤں سے خون نکلا تو گلاب سرخ ہوگیا۔ حسین آنکھوں سے آنسو نکلے تو گل بابونہ بن گئے۔ سارے موسم، بہار، پھول سب بدن کی رہین منت ہیں۔ بدن ہی سے پھوٹتے ہیں موسم، بدن ہی سے اگتے ہیں سارے رنگ۔ زندگی بدن ہے اور بدن کے بغیر کائنات بے کیف ہے۔

حسن کے بدن جلو میں چلتے ہوئے میں نے دیکھا ایک پہاڑ جہاں رات بھر آگ جلتی رہتی تھی اور صبح آگ دھواں بن جاتی تھی۔ ملکہ حسن نے کہا یہ ہے جزیرہ جاوا۔ یہاں کے لوگوں کو دیکھو جسم جمال کا نیا ادراک و عرفان حاصل ہوگا۔ میں نے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا کہ ان کے سینے پر چہرے آویزاں تھے اور گردن معدوم تھی — پھر کچھ دور چل کر ایک جزیرہ آیا۔ شاید جزیرہ سگسار۔ دیکھا تو وہاں لوگوں کے سر کتوں کے تھے اور جسم انسان کا سا تھا۔

ملکہ وہاں سے آگے بڑھی۔ ایک اور جزیرہ میرے سامنے تھا۔ دیکھا حسین و جمیل برہنہ مرد اور عورتیں، ان کے جسم بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے، یہ جزیرہ رامی تھا شاید۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ پہاڑ کی چوٹی پر انتہائی حسین و جمیل قوم آباد ہے۔ بالکل برہنہ، ان کی خوبصورتی کی نظیر نہیں ملتی۔ ملکہ نے بتایا کہ یہ جزیرہ بنان ہے۔ یہاں ہر طرف حسن ہی حسن ہے۔ جمال ہی جمال۔ بدن کا جمال، روح کا جمال۔ ملکہ نے کہا اسے کہتے ہیں جمال اور تم چاہو تو دیکھ سکتے ہو جمال کا جاہ و جلال۔ وہ مجھے ایک جزیرے میں لے گئی جہاں ایک ملکہ بالکل برہنہ، تخت پہ بیٹھی تھی۔ چار ہزار عریاں دوشیزائیں اس کی خدمت میں مامور تھیں اور اپنے جمال کا جادو جگا رہی تھیں۔ دیکھو ان کے جسم کا تناسب، بدن کا توازن، ان کا پُراسرار چھتنار بدن، ان اپسراؤں کے بدن، ان کے

چھلکتے ہوئے جسم کو دیکھ کر تمہارے وجود میں لرزش پیدا ہو جائے گی۔ ملکہ یہ بات بتا رہی تھی کہ اچانک وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ پھر ایک دن ایک رات کے بعد بالکل ملکہ جیسی ایک شکل نظر آئی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس کی تجاہل پیشگی پر حیرت ہوئی، اس نے کہا کہ شاید تم چہروں کی یکسانیت دیکھ کر میرا غلط نام لے رہے ہو۔ میں ملکہ افرودیت نہیں، مدن سینا ہوں۔ وہی مدن سینا جو ساون کے مہینے میں اپنی سکھیوں کے ساتھ جھولتی گاتی تھی۔ ارتھادت کی بیٹی، سمرردت کی منگیتر ۔ پھر کئی ایام کے بعد مدن سینا کو میں نے کسی بوڑھے آغوش میں دیکھا تو پھر مجھے تحیر ہوا کہ مدن سینا تو وفاشعار ستی ساوتری تھی اور پھر اس کا شوہر بھی جوان رعنا تھا، تو اس نے پھر میری حیرت کو رفع کرتے ہوئے کہا۔ میں وہ نہیں جو تم سوچ رہے ہو، ملکہ شبروزی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص شبروزی کے برہنہ جسم کو اپنے بوڑھے ہونٹوں سے چاٹ رہا ہے اور پھر خلوت گہہ ناز کا جو منظر تھا وہ 'تلقارمس' کے راوی کتھا گرو سریندر پرکاش کی زبانی......

"محل میں حرم کی قندیلیں روشن تھیں۔ ملکہ شبروزی اپنے بستر پر برہنہ لیٹی ہوئی طلائی جام سے شراب کا ایک ایک گھونٹ پی رہی تھی اور پھر اجانیر کی سپاہ کا افسر اعلی جھیل کے لیے ملکہ شبروزی نے اپنی دونوں بانہیں وا کردیں۔ جھیل نے اپنے خوبصورت گٹھے ہوئے جسم کو لباس سے آزاد کردیا اور پھر اپنے ہونٹ ملکہ کے ہونٹوں پر جما دیے۔ کسی غیبی ہاتھ نے قندیل بجھادی..."

جب ملکہ شبروزی اور جھیل صبح کا پہلا بوسہ ایک دوسرے کے ہونٹوں پہ ثبت کررہے تھے تو محل کے باہر ہر طرف رات اُتر رہی تھی اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ تلقارمس کے لبوں میں ملکہ شبروزی کے لب پیوست تھے۔ ملکہ کہہ رہی تھی اتنا دل پذیر نغمہ میں نے آج تک نہ سنا۔ یہ رس بھرا بوسہ میری قدردانی ہے۔ عورت جب کسی کی قدر کرتی ہے تو یونہی لازوال سوغات دیتی ہے......

"وہ دھیان ہی دھیان میں ملکہ شبروزی کے جسم کی اٹھانیں چومتا، گولائیاں

چاٹتا، ایک ایک عضو پر بوسے دیتا...''

اور پھر ایک دن تو غضب ہوا......

''ملکہ شبروزی حمام کے پوبچے میں برہنہ بدن نہا رہی تھی۔ اس کے پاؤں پتھر ہو گئے۔ جو جہاں رک گیا تھا وہیں کا ہو رہا۔ وہ جسم جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اس جسم سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا جسے اس نے اپنے دھیان میں چوما تھا، چاٹا تھا اور جس کے ایک ایک عضو پر ہزار بوسے دیے تھے۔''

''تلقارمس تو پہلے ہی ملکہ شبروزی کے جسم کی چاہت میں تڑپ تڑپ کر دل و دماغ کھو چکا تھا۔ اب تو اسے وہ جسم مہیا تھا اور وہ اس جسم میں بری طرح غرق ہو چکا تھا۔''

''نیم برہنہ سی ملکہ شبروزی تلقارمس کے روبرو کچھ اس طور آن کھڑی ہوئی۔ جسم کو خم دیے کہ اس کا حلق سوکھ گیا، لب خشک ہو گئے اور خشک لبوں پر سوکھی زبان پھرنے لگی۔ نیم برہنگی سے برہنگی تک پہنچتے پہنچتے ملکہ شبروزی نے جیسے زمانے گزار دیے۔ پھر اس نے بڑھ کر پورا جام بنایا اور جام تھامے تلقارمس کے سامنے دراز ہو گئی۔ چند ہی ساعتوں کے بعد ایک ہاتھ سے اس نے جام اپنے گول رس بھرے نوکیلے پستانوں کے بیچ تھام کر دوسرے ہاتھ کی انگلی جام میں ڈبو کر، بھگو کر پستانوں کی مرجھائی کلیاں ترکیں۔ کلیاں جیسے جاگ گئیں۔ اس رات ملکہ شبروزی اپنے جسم کے ہر حصے پر جام کے جام لنڈھاتی رہی اور تلقارمس ملکہ شبروزی کے جسم سے قطرہ قطرہ شراب کی طرح نچوڑنے لگا، وہ بہت مسرور تھا۔ اس کا دل مسرت سے بھر گیا۔ اس سے زیادہ سکون بھلا زندگی میں کہاں ملے گا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ تیرا شکریہ!''

''تلقارمس کے آغوش میں ملکہ شبروزی کا سونے میں ڈھلا ہوا جسم تھا۔

سارے میں دھند لکا تھا۔ دور ایک کونے میں مدھم سی قندیل جل رہی تھی۔
اس نے ایک بار پھر ملکہ شبروزی کے پستانوں کی رس بھری کلیوں سے شراب
پی۔ پھر وہ چونک اُٹھا۔ اُسے محسوس ہوا۔ ساتویں آسمان سے کوئی آواز اس
تک پہنچ رہی ہے۔ تیرا شکریہ!''
ملکہ شب روزی کے جسم کی شراب میں تلقارمس ڈوب چکا تھا۔
''آتش بیاں مغنی تلقارمس اپنا غیاب ایک بدکار عورت کی فرج میں
بھول بیٹھا۔''

یہ المیہ صرف تلقارمس کا نہیں ہے۔ شکست کمال کی ایک نہیں، ہزاروں کہانیاں ہیں۔ دشنہ مژگان جمال کے قتیلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ ذہن اور ضمیر پر جمال کی فتح ہے۔ ہم آغوشی آرزو، قرب جاناں میں بہتوں نے جان گنوائی ہے۔ ایک ایک تصویر اُبھرنے لگی۔

مرینہ جس کا جسم اس کی پوری کائنات تھی، اس کی عشوہ طرازیوں کے سامنے خدا رسیدہ تارک الدنیا ہوداو یہ اپنا سارا زہد چھوڑ کر اس کے جسم کی آرزو میں تڑپنے لگا۔ اس کی متوالی چال، اس کے غمزۂ بیباک سے وہ لاچار ہو جاتا ہے۔ بالآخر ہوداد یہ اس کے جسم کی غار میں اپنا زہد اپنا سارا تقویٰ بھول جاتا ہے اور جب کمال، جمال کے سامنے اپنی اکڑ دکھاتا ہے تو اس کا حال یوحنا کی طرح ہوتا ہے اور اس کے لیے سلومی جیسی ناکتخدا وبال جاں بن جاتی ہے۔ سلومی زلیخا کی طرح دامن یوسف کو تار تار نہیں کرتی۔ بلکہ انتقام لیتی ہے۔ وہ یوحنا کے جمال کی تعریف کرتی ہے۔ اس کے ہونٹ، اس کے جسم کے قصیدے پڑھتی ہے اور ان کے ہونٹوں کو چومنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے مگر یوحنا اس بات سے انکار کر دیتا ہے تو سلومی میں انتقام کا جذبہ موجیں مارنے لگتا ہے اور وہ ہیرودیس سے وردان مانگتی ہے۔ وردان میں بھی یوحنا کا سر اور پھر یہ وردان پورا ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ میں یوحنا کا بریدہ سر ہوتا ہے۔ وہ اس بریدہ سر سے کلام کرتی ہے اور اس کے جسم کے ایک ایک عضو کو چومتی ہے اور کہتی ہے کہ میں تیرے حسن کی پیاسی، تیرے

جسم کی بھوکی ہوں اور اس طرح ایک بار پھر جمال اپنا کمال دکھاتا ہے۔

اِنونی بھی پیرس سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ اپنے جمال کا جادو جگاتی ہے۔ مگر جب پیرس ہیلن کی طرف ملتفت ہوتا ہے تو انونی کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں اور وہ پیرس کو جب بھڑکتی ہوئی چتا میں دیکھتی ہے تو اس چتا میں خود بھی کود جاتی ہے اور اس طرح اپنی محبت اور وفاداری کا اظہار کرتی ہے۔ یہ سب بدن کے جمالیاتی مظاہر ہیں۔ بدن کے بنا ہر چیز نامکمل ہے۔ بدن ہے تو روح بھی ہے۔ بدن نہیں ہے تو آتما کھوکھلی ہے۔

ان متحرک جمال تصویروں کے ساتھ ہی واجد علی شاہ کے پری خانے کا نگار خانۂ جمال کھل جاتا ہے۔ خوبصورت جسم میں جو کشش ہوتی ہے، وہ پری نامہ کے ایک ایک صفحے میں موجود ہے کہ کم سن بالک کے جمال کو ایک چالیس سالہ فربہ بدن عورت اپنی آنکھوں میں جذب کرلیتی ہے اور پھر ایک رات ران پر ایک ہاتھ مار کر اور ہاتھ سے سرین کو فشار کر کے خود لحاف بن جاتی ہے اور سحر تک سفینے سے سفینہ، سینہ سے سینہ چپاں رہتا ہے۔ پری نامہ میں جمال کے بہت سارے نقوش روشن ہیں۔ واجد علی شاہ نے اس حسن جہاں سوز کی عکاسی یوں کی ہے......

سمن بر، حسین، سروقد، لالہ رو
دہن غنچۂ گلشنِ آرزو
وہ آنکھیں کہ دونوں ہلاہل کے جام
کریں دم میں جو کارِ عاشق تمام
وہ ابروے پیوستہ تھے یوں عیاں
جھکے جیسے کشتی کو دو پہلوان
لوین کان کی طرفہ مضمون نو
کہ گل جن سے شمع تجلی کی لو

جبین وہ نہ تھی مطلعِ نور تھی
خجل جس سے پیشانیٔ حور تھی

وہ بازو وہ ساعد عجب گول گول
غلامی میں لین شمع روشن کو مول
غرض جتنے اعضا تھے اس حور کے
ڈھلے تھے وہ سانچے میں سب نور کے
لبوں پر مسی سرمہ آنکھوں میں تھا
پڑی جانِ عاشق پہ دوہری بلا

پری خانے میں پنبہ و آتش، شیشہ و سنگ کے وصال و اتصال کی بہت ساری داستانیں ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ جسم میں ایک مقناطیسی کشش ہوتی ہے جو عمروں کے تفاوت کو بھلا ڈالتی ہے۔ جسم جمال کی، نہ کوئی سرحد ہے اور نہ کوئی لکیر۔ ہر ایک نفس جمال کا اسیر و قتیل ہے۔

پری نامے کے طلسماتی حصار سے باہر نکلنے کے بعد مجھے ایک آواز سنائی دی۔ عجیب سی آواز۔ اس کا مفہوم میرے اوپر واضح نہیں ہوسکا۔ لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نازکی حسن بدن کا بیان ہے۔ آواز میرے سینے میں اترتی چلی گئی......

نازک دینہ کمر کی پتلی سولہ کئے سنگار
روپ دیکھ رمن شہزادہ ہوگیا عاشق زار
انوٹ بچھوئے گھنے، پاؤں میں پائل بھاری
چوڑی لچھے دار پڑی جھانجھن پہ ساری
پور پور میں چھلے پہنے بازو بند برائے
چھتیوں اوپر پڑا ڈھولنا، جگنو کرے بہار

چمپ کلی اور ہار گلے دورلی چمکے
ٹیکا دیوے بہار، ماتھے پہ بیندا چمکے
کیس کاڑھ چوٹی کو باندھا بھر کے مانگ سیندور
پری اِندر کی بن رہی تھی ایسا اس پر نور
اور پھر ادھر چھکڑے کی صوتِ ہزاراں کانوں میں رس گھولنے لگیں......

انگیا جو اُدھڑی کرکر درجی کا دوکھ نہ ہوئے
اٹھت امر دونوں جوبنا نکرے پسریاک پھور
گوری گوری بہیاں گوری گودنا گوداویں، جیسے چنری رنگے رنگریز
چھتیاپے گود دے ارے گودن ہاری، بھیرے چھیلوا کا ناؤ

بدن کے جمال کا احساس ہر فرد، ہر نفس کو ہے۔ مکان و مقام کی قید نہیں۔ خوبصورتی اور حسن ہر انسان کی پسند ہے۔ بدن کا حسن ہی محبوب کی آنکھوں میں معشوق کو حسین بناتا ہے۔ تبھی تو ایک دیہاتی عورت اپنے احساسِ جمال کا اظہار یوں کرتی ہے......

سانوریا بنارس سے منگا دو چوڑیاں
سبج رنگ پہنا دو سانوریا
گوری گوری بہئیاں سبج رنگ چوڑیاں
جھم جھم چمکے کلائی ہمار
ساٹھن کے لہنگے پہ گوٹا چمکے
ماتھے پہ چمکے بندیا ہمار
دھنی چندریا منگادو سانوریا
بنارس سے چوڑیاں منگا دو سانوریا

اسی طرح ایک سکھی دوسرے سکھی کو ساون کے مہینے میں سولہ سنگار کی ترغیب دیتے ہوئے اُسے اپنے بدن کے جمالیاتی زاویوں سے آشنا کرانے کے لیے کہتی ہے......

ساون آیا سکھی ری ساون آیا... رے
ماتھن مہندی پاون میں منہدی
رچا لے سکھی ری ساون آیا... رے
کالے کالے بالن، بیچ بیچ موتین مانگھ بھرالے
کر لے سنگھار سکھی ری ساون آیا... رے
لمبی لمبی چوٹیا میں گھونگھرو بندھالے
گوری گوری بہئیاں میں ہری ہری چوریاں
کنگن پچھیلا بیچ میں چھن چھن پٹ ریناں
کر لے سنگھار سکھی ری ساون آیا... رے
چھن چھن بچھوا باجے کڑا چھڑا جھنکا رے
ساتھن لہنگا دکنی چندریا سہاوے
گھونگھٹ سے چمکے چھب کے، نک بیریا دکھاوے
اپنی اپنی بہار بہار سکھی رے کرے سنگھار رے

○○

(۴)

''۔۔۔ نیل کنٹھ، تم میرے پتی ہو اور میں تمہاری گندھر و ریت سے وِواہت پتنی، جو کہو گے، وہی کروں گی ورنہ آگ میں جل جاؤں گی، پرنتو میرے ہاتھ تو دیکھو جن پر ریکھائیں ہی ریکھائیں ہیں۔ پہلے ان ہاتھوں کو مہندی سے تو رچ لوں... یہ آنکھیں بھی تو دیکھو! کتنی سادی ہیں یہ کہ ان سے کیول نظر آتا ہے، پہلے ان میں تھوڑا سا کاجل تو آنج لوں کہ تم مجھے نہار سکو... مولسری کے کنٹھوں کو تو دیکھو، کتنے خوبصورت ہیں یہ، مجھے کیسے ترس رہے ہیں، پہلے ان کو اپنے بالوں میں تو اڑس لوں کہ مجھے سونگھ سکو... ان ہونٹوں کو تو دیکھو، موں گھر بنے کیسے مانگ رہے ہیں۔ کیسر کے وسنوں میں چھپی اوس کی ایک بوند، پہلے ان کو بھگو تو لوں کہ تم مجھے چکھ سکو... نیچے، تمہاری آنکھوں کے بالکل نیچے میرے پاؤں بھی تو پڑے ہیں، کتنے ہلکے ہیں یہ بیچارے، بے تال اور سُر سے خالی، مجھے پہننے تو دو چاندی کی جھانجھریں کہ تم مجھے سن سکو... ہاں، اب میں جاتی ہوں... جب چاند نکلے گا اور رات کا ایک پہر بھیگ جائے گا، تب میں تمہارے پاس آؤں گی... تب تک تم پنگل اور چھندوں کی رچنا کرو کہ جب میں تمہارے قریب آؤں تم مجھے محسوس کر سکو...'' (ص:۵۲)

نیل کنٹھ تکتا رہا نمرتا کو، پھر نمرتا نے کہا......

... دیکھو یہ روپ سروپ... یہ کرن پھول، یہ چندر کرن، یہ کرن بھوشن... یہ رتناولی، یہ گیندے کے پھول، یہ بیلے اور چنبیلی کی سفید پتیاں... یہ کانوں

کے گلنار منڈل، یہ منکوں والی مالا کا گھیرا، یہ بالوں کے بیچوں بیچ لال گلال... یہ ماتھے پر گتھی ہوئی سہاگ چھاپ، یہ موتی سے آنجا ہوا کاجل... یہ ادھروں پر لپٹا ہوا اگنی گلاب، یہ اطلسی کپڑے سے کسا ہوا میرے بدن کا شیر شک... یہ لہلہاتا ہوا منگل سوتر... میں نے جو کہا ہے اور جو اب تک نہیں کہا، سب کچھ مسلا جائے گا، جاتی رات کے سنگ، صبح کے اسنان سے پہلے... کارن اور کریا سوچنے کا کوئی سمے نہ ہوگا... وہ سویم ہی ہوتے رہیں گے کہ ان کا سویم ہی ہونا ست ہے... تو اے نیل کنٹھ، آؤ میرے پاس کہ تمہیں سجا دوں... مل دوں تمہارے بدن پر پیلی ہلدی کہ چمکنے لگو تم اس رات، پرتھوی پر چندرما سے زیادہ جو کم روشنی دے رہا ہے... چھاپ دوں تمہارے ماتھے پر بھورے چندن کا تلک کہ آکاش سے کوئی پری اتر کر تمہیں اپنی آنکھوں میں نہ بھر لے... تم پرتھوی پر چلتے رہو جب تک پرتھوی چلتی ہے... تو اے نیل کنٹھ، آؤ میرے پاس، میں تھوڑی دیر رو لوں کہ تم ہمیشہ ہنستے رہو اور میں تمہاری آرتی اُتارتی رہوں... میری آنکھیں بھکتی سے جلتی رہیں، ہمیشہ مرگ نینی بنی رہیں، کوئی مرگ ترشنا نہ بجھا سکے ان آنکھوں کی جیوتی کہ انہوں نے تمہیں دیکھا ہے... تو اے نیل کنٹھ، آؤ میرے پاس کہ پلا دوں تمہیں اپنے ہاتھوں سے شراب کا پیالہ، اور تم بھول جاؤ سارے موسم اور پرشٹھوں پر چھپے پریم شاستر... کہ تم سویم مجھے لکھ سکو... میں بنتی رہوں تمہاری کتاب کے پنے... جب تم گھر کی اور لوٹو اور راہ میں مل جائے تمہیں برگد کا پیڑ، یا تم سنو کسی شیر کی دہاڑ، کسی کوّے کی کائیں کائیں، کسی ناگ کی پھنکار یا تم دیکھو کسی اَرتھی سے لپٹے ہوئے کسی ابلا کے ہاتھ اور ارتھی کے ساتھ چلتی ہوئی لمبی عمروں والی مکھا کرتیاں... تو تم مجھے یاد کرنے لگو، کیول مجھے اور بھول جاؤ یہ سارے درشیہ کہ ورکتی تمہاری کتاب کا کوئی ادھیائے نہیں... تمہیں کبھی وِرَکتی نہ ہو...

نیل کنٹھ ! آؤ اب روانہ ہوں اسی کدم کے جھنڈ کی اُور جہاں ہم پہلی بار ملے تھے... میں نے بنا لیا ہے وہاں ایک گھر، لکڑیوں سے بنا اور پھولوں کے بستر سے سجا کہ اب ہم دونوں، اکیلے تھوڑے دن، ایک ساتھ، اس گھر میں رہیں گے... (ص:٦٠)

بدنی جمال کی تمام تر رعنائیاں سمیٹے نمرتا کو جب نیل کنٹھ نے دیکھا تو اس کا 'بھے' ٹوٹ گیا... اور وہ پڑھنے لگا نمرتا کا ماتھا جس پر سجا ہوا تھا ایک تلک اور تلک میں نظر آ رہی تھی نمرتا، انیک ناگوں سے کسی بندھی... پھر وہ نمرتا کے ماتھے پر ہونٹ رکھ کر رونے لگا اور جب رات کا ایک پہر گزر گیا تو اس نے جلتے ہوئے روئی کے پھویوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھ دیں کہ وہ اندھیرے میں نمرتا کو دیکھ سکے... نمرتا مسکرائی، پھر اس نے جلتے ہوئے روئی کے پھویوں پر رکھی ہوئی نیل کنٹھ کی ہتھیلیوں پر اپنی ہتھیلیوں کا اسپرش بکھیر دیا......

'نمرتا' کے خالق صلاح الدین پرویز کا جمالیاتی وجدان، سوندریہ شاستر کے گیانیوں کو چونکاتا بھی ہے اور شرنگار رس کے کویوں کو لجاتا بھی ہے۔ جمالیات کا یہ عرفان و ادراک، سوندریہ میمانساؤں میں کم کم ہی نظر آتا ہے کہ 'نمرتا' سے جمالیات کی جو گنگائیں، جمنائیں پھوٹتی ہیں، وہ سرسوتی بن جاتی ہیں۔ سرسوتی جو بہت ہی مقدس ندی ہے اور جو اپنے پانیوں میں دودھ اور شہد پیدا کرتی ہے...

صلاح الدین پرویز کو جمالیات کا گیان، دو کرداروں کے صدیوں پر محیط آسمان، سے دھرتی تلک کی یاترا کے بعد حاصل ہوا ہے۔ یہ اصلاً دو کردار نہیں بلکہ ایک ہی کردار کے دو انگ ہیں: ایک انگ نمرتا ہے اور دوسرا نیل کنٹھ... یہ دونوں انگ کبھی ملتے ہیں، کبھی بچھڑ جاتے ہیں... ان کا ہجر بھی وصال سا اور وصال بھی ہجر سا ہوتا ہے۔ اسی یگوں کے ملن، صدیوں کی بچھڑن سے 'نمرتا' کی تشکیل ہوئی ہے اور یہ ایسی لازوال جمالیاتی تشکیل ہے جس کی نظیر ادبیات عالم کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔

اس جمالیاتی اسطور کا ایک انگ 'نمرتا' آسمان میں 'سویتار' کی شکل میں تھی جو انتر کش میں آ کر 'اوشا' کا وہ جمالیاتی پیکر بن گئی جسے رِگ وید کے جمالیاتی تخیل میں یوں روشن کیا گیا ہے......

''اس سندر اور جوان عورت کی طرح جس کا اس کی ماں نے بناؤ سنگھار کیا ہے، ایک بنی سنوری ہوئی رقاصہ، ایک بھڑ کیلے شوخ لباس والی پتنی جو اپنے پتی کے سامنے آ رہی ہو، اس ناری کے مانند جو اشنان کے بعد دمکتے ہوئے بدن کے ساتھ باہر آئے۔ مسکراتی ہوئی، دل موہ لینے والی شکتی پر پورا وشواس کیے۔ وہ ہر دیکھنے والے کی نظروں کے سامنے اپنی چھاتیوں کو ننگا کر دیتی ہے۔''

پھر نمرتا نے جنگلوں کی ملکہ ارنیانی کا روپ دھارن کر لیا، ایک دل موہ لینے والی مگر پُر اسرار اور ہیبت ناک خوشبوؤں میں نہائی ہوئی جنگل کی رانی جسے رگ وید میں یوں خطاب کیا گیا ہے......

''جنگل کی رانی کسی کو مارتی نہیں جب تک دشمن اس کے قریب نہ چلا آئے۔ وہ میٹھے جنگلی پھل کھاتی ہے اور مرضی ہو تو آرام کر لیتی ہے۔ لو میں نے جنگل کی رانی کی تعریف کر دی۔ وہ رانی جو کہ خوشبوؤں میں نہائی ہوئی تازہ اور صحت مند ہے اور وہ اگر چہ دھرتی میں ہل نہیں چلاتی لیکن جو ہر جنگلی شے کی ماں ہے۔

اور پھر یہی 'اوشا' سرسوتی بن گئی، ایک مقدس ندی۔ اس طرح اس نے آسمان سے سارے رشتے توڑ لئے اور دھرتی سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ یہیں سے شروع ہوتی ہے نمرتا کی نئی بھومیکا۔

آسمان سے دھرتی پر اتر کر نمرتا ندی کی ایک تمثیل بن گئی، تحرک و تموج سے لبریز ایک تسلسل کا اعلامیہ۔ ندی جو سمندروں کے وصال سے سدا سہاگن رہتی ہے، کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔

نمرتا نے دھرتی پر پراکرتی کا روپ دھارن کرلیا اور اس روپ میں وہ ایک بہت بڑے بدن والی گٹھی ہوئی عورت کی شکل میں نیل کنٹھ کے خواب میں آئی۔ یہ وہی نمرتا تھی، جس کا پورا وجود آتما کی روشنی سے گندھا ہوا تھا اور اب یہی پراکرتی پرش کی آرزو میں تڑپ رہی تھی۔ اس پراکرتی نے منش کو یہ بتایا کہ......

''گھر کوئی سندر واکیہ، کوئی سندر شبد نہیں ہوتا ہے جس کی زمین پر اُگے ہوتے ہوں، دیکھے اور ان دیکھے یگوں کے شجر، گھٹا ٹوپ اندھیرے اور ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں چھپے روشن راستوں والے بزرگ، عبادت گزار اور خوبصورت جنگل جن کی چھتنار تلے شہد کا ایک ایسا دریا بہتا ہو جسے ہم اپنے ہونٹوں کی گولائیوں میں سموسکیں اور سانسوں کے سروں میں الاپ سکیں... گھر صرف گھر ہوتا ہے، لکڑی سے بنا اور مٹی سے گڑھا جو بادل کے کانپنے سے سہم جاتا ہے، ہوا کے چلنے سے لڑکھڑا جاتا ہے، پانی کے بہنے سے ڈوب جاتا ہے اور آگ کے بھڑکنے سے جل جاتا ہے۔''

پراکرتی کے روپ میں یہی نمرتا وہ رقاصہ تھی جو سرخ کٹے ہوئے تازہ انجیر کی طرح کومل ہونٹوں سے لوگوں کو آنند کا راستہ بتاتی تھی اور اپنے بوسوں کے جادو سے گیان جگاتی تھی۔ پراکرتی کے روپ میں ڈھل جانے کے ہزاروں برسوں بعد جب نیل کنٹھ کو نمرتا نے دیکھا تو وہ پہچان گئی......

''تم نیل کنٹھ ہو نیل کنٹھ۔ نرے نیل کنٹھ ... تم مجھے نہیں جانتے؟ ہاں، تم جان بھی کیسے سکتے ہو... میں نمرتا ہوں، نمرتا... بچپن میں تم کبھی ایک بار ملے تھے... اپنی بالک ہٹ کے ساتھ تم نے کہا تھا، تم میرے ساتھ میرے ہی گھر میں رہو گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے... میں نے تمہیں منع کر دیا تھا۔ میں نے کہا تھا، پرتکشا کرو، ایک ایسی تبدیلی کی جو مجھے تم میں اور تمہیں مجھ میں پری ورتت کردے... اور تم، تم چلے گئے تھے دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے... آج لوٹے ہو، بولو، میں تمہیں کیا دے سکتی ہوں...''

تب نیل کنٹھ نے کہا......

''نمرتا، میں شاید کبھی نیل کنٹھ تھا بال اوستھا میں... اب تو کئی ورشوں سے میں سمراٹ ہوں اور میری سمرن یدھ کے کسی میدان میں کھوگئی ہے... نمرتا، میری پیاری نمرتا میں جیون بھرارتھ شاستر ہی لکھتا رہا ہوں... ایک بار کیول ایک بار لکھوا دے ایک پریم شاستر کہ میں پھر سے نیل کنٹھ بن سکوں...''

نمرتا نے اپنے کومل شیتل بدن کے جمالیاتی سحر سے آخر نیل کنٹھ جیسے سمراٹ کو یہ احساس دلا دیا کہ ہر یدھ جیتنے والا یہاں آکر یدھ ہار جاتا ہے......

''اب وہ ایک ایسا سمراٹ ہے جو یُدھ ہار چکا ہے، اس کے سارے منتری، سیناپتی، فوج اور یدھ کا سارا سازوسامان مٹی میں تبدیل ہو چکا ہے جس میں ماس کی شکتی شالی سگندھ رچی ہوئی ہے جو بے چین ہو رہی ہے کہ کب آزاد ہو، کب ساری دھرتی کو آزاد کر دے۔ خشک سالی اور قحط سے موسموں کو پت جھڑ اور بانجھ پن سے کہ اس بار خوب پانی برسے، آکاش تلک فصلیں لہلہائیں۔''

دراصل بدن ایک مقناطیسی کشش ہے چاہے پدماوت ہو یا سیتا، رادھا ہو یا کوئی اور جمالیاتی پیکر، منوہر خوبصورت موہن روپ دیکھ کر بھی کے شریر میں امنگ کی داوری آجاتی ہے اور یہ ابھیلاشا کرتی رہتی ہے کہ اپنے محبوب کو نہارتی رہیں اور ان کے روپ کی جیوتی جلتی رہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ رادھا کی دیہہ دیپتی کو دیکھنے کے لیے گھڑی بھر کے لیے جمنا بھی ٹھہر گئی تھی اور سچی بات یہ ہے کہ سیتا، پدماوت یا رادھا سبھی نے جادو بدن کی راہ سے ہی آنند آشرم میں وِشرام کیا۔ بدن سے ہی جنم لیتی ہیں ساری عشق کہانیاں اور بدن کی جمالیات سے ہی روشن ہوتی ہے تخیل کی کائنات۔ اگر بدن کے جمالیاتی زاویے آنکھوں میں روشن نہ ہوں تو عشق کا سورج بھی کبھی طلوع نہ ہو...

یہی نمرتا کالی داس کی رچنا میں شکنتلا بن کر عشق اور جمالیات کا زندہ استعارہ ہو جاتی ہے......

''اس نے نمرتا کے گلے میں ایک مالا ڈال دی، پھر نمرتا کی ایک انگلی میں انگوٹھی پہنا دی کہ اگر وہ نمرتا کو بھول جائے تو انگوٹھی اسے یاد دلا دے کہ نمرتا کے ساتھ اس کا گندھرو واہ ہو چکا ہے — بھول جانے کی کریا ابھی تک نیل کنٹھ کے گلے میں روشن تھی، شاید اسی لیے نمرتا نے دوسری ور مالا نیل کنٹھ کے گلے میں ڈال دی۔''

نمرتا اور نیل کنٹھ کا وصال ہی دراصل جمالیات کی اساس ہے۔ اس کے جمالیاتی نقوش اجنتا، الورا اور کھجوراہو کی گپھاؤں میں آج بھی منور ہیں اور وہ لہراتی ہوئی ساڑیوں کے نیچے دھاری دار پاجامہ اور انگیا پہنے ہوئے آج بھی رقص سے مسحور کر رہی ہے اور اسی رقص سے کائنات میں رنگ ہے۔

اس جمالیاتی اسطور کا دوسرا انگ نیل کنٹھ ہے۔ یہ پہلے وشنو کے روپ میں ایک شمسی دیوتا تھا۔ اِندر کا دوست، پھر اس نے سوریہ کا روپ دھارن کیا اور اس روپ میں وہ اوشا کا بیٹا تھا۔ اس کے بعد اِندر کے ہاتھوں ہزیمت کے بعد سوریہ نے نیا جنم لیا اور وہ اوشا کا عاشق بن گیا اور پھر یہ روپ بدلتے بدلتے نیل کنٹھ بن گیا، مگر ہر نیا روپ دھارن کرتے وقت پرانا روپ، اس کی یادوں میں چترت رہتا تھا۔

وشنو کے نیل کنٹھ بننے تک سویتار، نمرتا بن چکی تھی اور ندی بن کر سمندر کے سینے میں دفن ہو چکی تھی، اور نیل کنٹھ بھی مختلف یگوں کی یاترا اور روپ دھارن کرتے ہوئے اب تنہا اور ادھورا رہ گیا تھا۔ اب یہ دونوں اپنی نئی نئی بھومیکاؤں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ تبھی کچھ ایسا ہوا کہ دونوں ایک دوسرے میں پری ورتت ہو گئے۔ یہیں سے تکمیلیت کا وہ سفر شروع ہوا جو آتم گیان کی منزل پر جا کر منتج ہوا۔ نیل کنٹھ جو تشنگی کا درد لئے وجود کی داخلیت کی تلاش میں نکل پڑا تھا، ایک دن اس نے ایک عجیب سا خواب دیکھا......

''— رات ایک بہت بڑے بدن والی گٹھی ہوئی عورت ہے۔ سر پر گرمی کا تاج رکھے وہ ایک بہت بڑے محل کی ایک بہت بڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی

ہے۔محل میں بہت سردی ہے۔آس پاس سانسوں کی ننھی منی بچیاں کھڑی ہیں جن کے ہاتھوں میں خوابوں کی چھوٹی چھوٹی سینکوں کے بنے ہوئے پنکھے ہیں— رات پاؤں کے انگوٹھے سے انہیں اشارہ کرتی ہے اور وہ بے اختیار خوابوں کی چھوٹی چھوٹی سینکوں کا بنا ہوا پنکھا جھلنے لگتی ہیں— محل میں کئی دروازے ہیں جن میں سے خواہشیں رنگ برنگے لباس پہنے باہر نکلنا چاہتی ہیں کہ سانس لے سکیں، لیکن خوش قامتی کے ڈوروں میں بندھی یہ خواہشیں کھڑکیوں کی طرف دھکیل دی جاتی ہیں جو رات کی آنکھوں میں کھلتی ہیں اور جن میں کچے تجربوں کی سخت مٹی دھیرے دھیرے گیلی ہو رہی ہے جو یکسر بے بدن، بے آواز اور رہسیہ سے خالی ہے... اس نے دیکھا، سردی کی اس رات میں اس کے بدن کا سارا محفوظ پسینہ اس کے میلے پیراہن پر جھومتا گاتا، سرکو پٹکتا گرمی کو ایک جل مانس کا رتبہ عطا کرتا ہے اور وہ اپنے سمٹے سمٹائے بدن کو بوجھل قدموں پر سنبھالے کانپتی ڈرتی اور جھجکتی آنکھوں سے سارے برہمانڈ کی ساری سردی اپنے ہاتھوں کے پیالوں میں بھر کر پی جاتا ہے— تب اسے گیان ہوتا ہے کہ اس کے بدن کے شعلے سے، جس نے ابھی خوب گرج گرج کر پانی برسایا ہے، سارے لمحات بھیگ گئے ہیں اور لمحوں کے بھیگے ہوئے ان گنت لبادے رات کی ایک اجلی ڈوری پر یوں سوکھ رہے ہیں جیسے اس کی ذات دنیا کی پیدائش سے پہلے آدم کے پیڑ کی ننگی ٹہنی پر ننگی سوکھ رہی تھی...''

یہ خواب اس کی جستجو اور ابدیت کی آرزو کی تعبیر بن گیا، بہت بڑے بدن والی وہ عورت 'نمرتا' تھی جو ایک تکمیلی عنصر تھی۔ یگوں کی صعوبتیں اور آلام سہتے ہوئے نیل کنٹھ جب اپنے وجود کی تلاش یاترا پہ تھا تبھی اس پہ اس محجوب کا کشف ہوا کہ بدن اس کی جستجو کی راہ ہے اور پراکرتی ہی آتم گیان کی منزل ہے۔ نیل کنٹھ کے وجود سے لپٹا ہوا 'بھے' ختم ہوا اور اس نے ایک نئے گھر میں قدم رکھا اور اب......

''نیل کنٹھ بہت خوش تھا کہ اسے گھر مل گیا ہے، ایک چھوٹا سا گھر، پناہ کے زیر اثر جہاں وہ صبح سویرے رشیوں منیوں کے بتائے ہوئے آسن سادھ کر اَسنان کر سکتا ہے، پھر اوم کی حمد گا سکتا ہے، پھر پڑھ سکتا ہے سوم رَس میں ڈوبی ہوئی پُرانی پوتھیاں جن میں اوم کی کتھائیں درج ہیں...''

نمرتا اور نیل کنٹھ نے جب آسمانی لباس اُتار کر زمینی پیرہن اوڑھ لئے تو نیل کنٹھ آسمان کے بجائے زمین پر حکمرانی کرنے لگا۔ نیل کنٹھ منو بھی بنا اور منوسمرتی لکھی۔ رام بھی بنا اور بن باس کاٹا اور کوٹلیا بن کر اَرتھ شاستر بھی لکھی مگر وہ تو پریم شاستر لکھنا چاہتا تھا... سو اس نے جب اپنی کھوئی ہوئی نمرتا اور کھوئی ہوئی روح کو تلاش کیا تو لکھا اس نے ایک پریم شاستر اور بنایا نمرتا کو اپنا ایک شیر شک۔ نیل کنٹھ نے سب کچھ سیکھ لیا اور یہ جان گیا کہ نمرتا کے بغیر وہ ادھورا ہے، اندیشوں اور وسوسوں سے محض ایک تھکا ہوا پرش۔ کیونکہ نمرتا نہ ہوتی تو شاید وہ اپنی شناخت کے بحران کا شکار ہوتا اور اسے آتم گیان کی وہ منزل نہ مل پاتی جو نمرتا کے ہونٹوں کی راہ سے اسے ملی۔ نیل کنٹھ اور نمرتا کا پھر آخری عرفانی وصال ہوا اور نیل کنٹھ نے یہ جانا کہ عرفان کی یہی منزل ہے اور وجود کی یہی دریافت، جسم ہی ازلی حقیقت ہے اور جسم کے بغیر روح کا عرفان ممکن نہیں۔ اسی لیے نیل کنٹھ کو جب نمرتا نے آسمانی مناجات پڑھنے کو کہا تو اس نے یہ ارضی مناجات پڑھی......

نمرتایاہ مانمرتام گے
نمرتایاہ مانمرتام گے
نمرتایاہ مانمرتام گے

یہی وہ جسم کا عرفان اور جمال ہے اور اسی جسم میں پنہاں ہے وہ اسم اعظم 'اوم' جو ترشنا کو ترپتی عطا کرتا ہے اور ادھورے پن کو تکمیلیت کا لباس۔

'نمرتا' دراصل ارضی جمالیات کی نئی دیومالا ہے جس میں دونوں کردار ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ہی مکمل ہوتے ہیں اور یہی وجود کی تکمیلیت ہے اور یہی ایسم آنند اور یہی کائنات کا جمال ہے۔ ستیم شوم سندرم...

صلاح الدین پرویز کا جمالیاتی شعور، والمیکی، کالیداس، امارو، ماگھ، بھاروی، بھاس، مان کے جمالیاتی تخیل سے مختلف اور سندر ہے۔ کالی داس نے 'پاروتی' کا جو سروپ ورنن ''کمار سمبھو'' میں کیا ہے، صلاح الدین پرویز نے نمرتا کا ورنن اسی حسین انداز میں کیا ہے۔ بھبھوتی نے 'مالتی مادھوم' میں مالتی سوندریہ کو تخیل کا جو حسن عطا کیا ہے، نمرتا میں اس تخیل کی معراج ملتی ہے۔ جے شنکر پرشاد نے 'کامائنی' میں جمالیات کو شعور کا روشن وردان کہا ہے اور 'نمرتا' اس خیال کی ایک روشن تمثال ہے۔ صلاح الدین پرویز نمرتا کے سروپ ورنن میں حسن تخیل کے ساتوں ساگر کو ایک ہی جست میں لانگھ گئے ہیں۔

ماں کے روپ میں 'نمرتا' ممتا کی منداکنی لگتی ہے۔ کامائنی کی شردھا کی طرح ایک آدرش ماں کہ جب نمرتا کے بدن میں درد کے دریا جاگتے ہیں اور کن کن میں سوئیاں چبھتی ہیں پھر بھی وہ خوش ہوتی ہے کہ اس کے گھر کے آنگن میں دھوپ ہی دھوپ بچھ گئی ہے... ماں بننا بھی ایک جمالیاتی عمل ہے اور یہ بدن کی تخلیقی جمالیات ہے۔

محبوبہ کے روپ میں 'نمرتا' اپنے محبوب کے چرنوں میں اپنی ساری محبت بھر دیتی ہے اور وہ نیل کنٹھ کی زندگی کی ایک انسپریشن بن جاتی ہے۔ اس روپ میں نمرتا پرتھوی راج راسو کی سینوگیتا، رام چرت مانس کی سیتا، پریہ پرواس کی رادھا اور کامائنی کی شردھا جیسی لگتی ہے۔ لجا، سرستا اور کشش سے بھرپور...

نمرتا، اپنے دلہن روپ میں بالکل اسی شکنتلا کی طرح نظر آتی ہے جس پر پوری کی پوری ایک رات گزر گئی ہو۔ پتنی روپ میں نمرتا نیل کنٹھ کی دکھ سکھ کی سمبھاگنی اور شکتی بن جاتی ہے۔ پاروتی کی طرح وہ اپنے ہونٹوں سے، ہارے ہوئے نیل کنٹھ کو زندہ کر دیتی ہے......

''اس نے دیکھا کہ نیل کنٹھ کا بدن نیلا پڑتا جا رہا ہے۔''

چلا پڑی یہ تم نے کیا کیا نیل کنٹھ... ! تم اتنی جلدی اپنے بدن سے اوب گئے۔ آؤ میرے پاس، آؤ میرے بہت نکٹ آ جاؤ نیل کنٹھ !''

نمرتا آگے بڑھی اور اس نے نیل کنٹھ کے کنٹھ پر اپنے دونوں اُداس ہونٹ پیوست کر دیے کہ جب تک یہ آسمان نیلا ہے اور دھرتی چلتی ہے تمہیں زندہ رہنا ہے......

نمرتا کے یہ سارے جمالیاتی روپ ہیں اور ہر روپ میں نمرتا مکمل ہے۔ جمال کا ایک ایسا پیکر جنہیں دیکھ کر ایک لمحے کو کائنات بھی ٹھہر جاتی ہے۔ جس کے ایک بوسے سے ایک مرا ہوا انسان بھی زندہ ہوسکتا ہے۔

صلاح الدین پرویز کی 'نمرتا' جمالیاتی سلسلۃ الذہب کی سب سے منفرد اور خوبصورت کڑی ہے۔ اس میں ہجر و وصال کی جمالیات کا جو لینڈ اسکیپ تیار کیا گیا ہے، وہ بہت ہی سندر ہے اور یہ دو تہذیبوں کی آویزش اور ارتباط کا بھی ایک منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ دراوڑی تہذیب اور آریائی تہذیب کے جمالیاتی تناظر کے ابعاد کو اُجاگر کرتا ہوا، یہ ناول بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ جسم کا اثبات کرتا ہے اور اس اثبات میں روح کا تحرک بھی شامل ہے اور یہی اس نمرتا کا مابہ الامتیاز ہے۔ نمرتا میں جمالیات کے سارے تشکیلی اور ترکیبی عناصر بڑی خوبصورتی کے ساتھ سما گئے ہیں۔ روپ کی کانتی اور دیتی، کپول کی للیما اور کیش کا کالا پن، مند مسکان، آنکھوں کی چنچلتا، ادھروں کی مدھوریما، لجانا شرمانا— جمالیات کے تشکیلی عناصر بڑی خوبصورتی کے ساتھ نمرتا میں ملتے ہیں۔ صلاح الدین پرویز نے نمرتا کے جمالیاتی نگار خانے کو اس طرح سے سجایا ہے کہ دیکھ کر آنکھیں چکاچوند ہو جائیں اور ایسی دنیا میں کھو جائیں جو حقیقت میں نہیں، صرف خیالوں میں حسین ہو سکتی ہے۔ ان کے جمالیاتی تخیل کے یہ دھنک رنگ دیکھئے......

وہ ہنس پڑی ہے اور اس کے ہنسنے سے ساری دھرتی پھولوں سے لد گئی ہے، وہ جھک گئی ہے دھرتی کی اور، اور سارے پھول اس نے اپنی دونوں بانہوں میں سمیٹ لئے ہیں، پھر کسی نے دبے پاؤں پیچھے سے آکر بڑی نرمی سے اس کے چہرے پر اپنے ہونٹ بچھا دیے ہیں۔ اس نے کچھ سنا بھی ہے اور لال ہوکر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے... دھرتی پھر پھولوں سے لد گئی ہے۔

- اس نے آمنے سامنے دو کھاٹیں کھڑی کیں، کھاٹوں پر سرخ چادر کی چھت تانی۔ سرخ چادر کی چھت تلے کھاٹوں کی چھاؤں میں اپنا بدن سمیٹا اور پھر ایک لتہ اُتارنے لگی— اپنا ننگا بدن دیکھ کر وہ شرما گئی، اس نے آنکھیں موند لیں، کہیں کوئی اور اسے نہ دیکھے کہ وہ پانی کے بلبلے کی طرح چھپ سے بہہ جائے گی۔
- اس کے بدن کے کسے ہوئے کپڑے، ہلکی سے گیلاہٹ لیے خوشبو بکھیر رہے ہیں۔ چاروں اُور وہ خوشبو جو عود کو ذرّہ برابر انگارے پر رکھ کر بیدار کی جاتی ہے کہ دیوتا سو نہ سکیں اور انو بھو کر سکیں۔ سانسار کتا جس سے پیدا ہوتا ہے ہمیشہ ایک مدھوسودن، ایک رنگ میں ہزاروں رنگ لئے جس میں نہاتی ہیں اور جھلملاتی ہیں دیویاں، آساوری اور رام کلی کی پریاں عورتوں جیسی شکلوں والیاں یعنی ابٹن ملی پرچھائیاں...
- نیل کنٹھ نے پہلی بار اپنی ماں نمرتا کے سینے پر اُگے ہوئے روئی کے دو پھویوں کو محسوس کیا تھا اور پھر اس احساس کو اپنے ننھے ننھے ہونٹوں کی کٹوری میں بھر لیا تھا۔
- تھوڑی دیر بعد نہر غائب ہوگئی، اب وہاں صرف دو سائے ہیں جن پر کسی نے کالی چادر تان دی ہے— اس نے اپنی ماں کو پکارا۔ خامشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر پکارا۔ اس کی آواز اس کے اپنے ہی کانوں میں ٹوٹ کر رہ گئی۔ وہ چیخا، چونکا اور اس کی آنکھیں کھل گئیں، پاس پڑے ہوئے پلنگ پر دو سائے گتھے ہوئے، ڈوری کی طرح بٹے ہوئے، سانپ جیسی شکلوں والے۔ اسی لمحے اسے اپنی ماں کی بوُ اَپنے نتھنوں میں پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ سنبھلا اور پھر اس نے دھیرے سے آگے بڑھ کر پاس رکھے ہوئے چراغ کی ٹوٹتی لو کو بڑھا دیا۔
- نمرتا کے دانت جیسے موتیوں سے تراشے گئے ہیں... جیسے اس کے دانتوں سے پانی کے جھرنے پھوٹ پڑے ہیں۔
- نہ جانے کہاں سے ان کی، کپاسی کولہوں اور بڑے بڑے استنوں والی لڑکیاں دوڑتی ہوئی آئیں اور ان کی بغلوں میں کھڑی ہوگئیں۔ مرد بدبدائے...... یہ ذرا

ذراسی بچیوں کے بدن میں پوری پوری عورتیں کیسے سما جاتی ہیں۔

- منچ کے ایک کونے سے لڑکیاں نکلتی ہیں اور دوسرے کونے سے مٹی کا ہاتھی— لڑکے ایک دوسرے کو آنکھ مارتے ہیں اور پھر آلنگنوں کی ماترائیں، پاجاموں کے نیفوں اور رومالوں میں اُڑس کر، شامیانہ تان دیتے ہیں— پھر مٹی کا ہاتھی سونڈ سے ٹپ ٹپ پانی برساتا ہے، سبھی لڑکیاں اپنی اپنی چولیوں سے اپنے اپنے سدرۃ المنتہیٰ نکال کر خلاؤں میں ٹانگ دیتی ہیں اور پھر ان کی شاخوں سے لپٹ جاتی ہیں۔
- کتنی ہی دیر ہوگئی تھی نیل کنٹھ اور اس کے بالک کو جنگل کی اُور گئے۔ وہ دونوں اب تلک کیوں نہیں لوٹے... یہ دن بھی کمبخت کتنا چھوٹا سا ہے، بس ثن بھر پہلے آسمان پر سورج طلوع ہوا تھا اور اب ثن بھر بعد آسمان پر چاند کی پتلی سی زرد لکیر چمک رہی ہے... دن نکلا بھی تھا یا نہیں، یا وہ رات ہی میں دن کی کلپنا کرتی چلی آئی ہے... نہیں، نہیں... ایسا کبھی نہیں ہوسکتا... صبح سے اس نے دیکھے تھے دل کی دھڑکنوں سے جدا ہوتے ہوئے کومل چرن جن کی آواز ابھی تلک اس کے سینے میں گونج رہی ہے...

صلاح الدین پرویز کی نمرتا سے ہمیں یہ گیان ہوا کہ......

- جسم، ایک گھر ہے جس میں بستے ہیں سارے دکھ اور سکھ۔ اس میں لگا ہوتا ہے 'بھید' کا ایک دروازہ۔ جس نے دستک دے کر اسے کھول دیا، وہ اسرار سے آشنا ہوا۔ ایسم آنند میں لین ہوا اور جو یوں ہی خوف کا لبادہ اوڑھے کھڑا رہا، وہ کبھی نہیں سمجھ پائے گا کہ جسم کے گھر میں کون کون سا رہسیہ بکھرا پڑا ہے، کیسے کیسے زندہ طلسمات اس گھر کے کونے کھدرے میں سانس لے رہے ہیں... اسی گھر میں اگتا ہے سورج اور اسی گھر میں ہوتی ہے دھوپ...
- جسم، ایک ندی ہے جو وشال سمدر سے وصال کے بعد سدا سہاگن ہو جاتی ہے۔ وہ

سمدر جس میں آگ بہتی ہے اور وہ آگ بہت شیتل ہوتی ہے۔

- جسم، ایک کنواں ہے، پانی سے بھرا ہوا، جس کے من پر کتنے نئے پرانے، یگوں یگوں کے تھکے ہارے سرخ اور شوخ کومل ہونٹ تک رہے ہیں بھیتر کی اور کہ 'چندرما' نظر آجائے یا ایسا کچھ جس سے اپنی آنکھوں پر جمی ہوئی برسوں کی منجمد پیاس بجھا سکیں اور سلگا سکیں اپنے بجھے ہوئے چہروں سے انگ انگ۔
- جسم، ایک رات ہے جس میں چھپ جاتے ہیں سارے دکھ اور اس میں وشرام کرتے ہیں سکھ کے سارے پرندے جو بھور سے اپنی دکھوں کی اُڑان پہ نکل جاتے ہیں اور پھر رات گئے زخمی شکستہ پر لیے لوٹتے ہیں اور اس دروازے پر دستک دیتے ہیں جس میں رکھے رہتے ہیں، زخموں کے مرہم، دکھوں کا مداوا۔

اور 'نمرتا' ہی سے ہم نے یہ جانا کہ......

- دن میں کتنا اندھیرا ہوتا ہے اور رات میں کتنی روشنی — اور ایک رات میں ہوتی ہیں، ہزاروں راتیں... رات میں سورج، بدن کے بھیتر طلوع ہوتا ہے اور دن میں باہر، برہ کی آگ میں جلتا رہتا ہے...

صلاح الدین پرویز کی نمرتا ایک بہت خوبصورت جمالیاتی استعارہ ہے اور اس استعارہ کے خالق صلاح الدین پرویز نے اسے اپنے منفرد اسلوب اور سیال تخلیقی نثر سے ساری کائنات کا جمال عطا کر دیا ہے۔ نمرتا کا جمالیاتی تناظر اور کینوس کافی وسیع ہے، اس میں صرف ایک عہد سے وابستہ کردار نہیں بلکہ یگوں اور صدیوں پر محیط کردار کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ کالی داس کی شکنتلا اور ملک محمد جائسی کی پدماوت تو ایک خاص عہد سے وابستہ ہے اور رادھا بھی ایک مخصوص دور سے جب کہ صلاح الدین پرویز کی نمرتا کسی عہد سے مخصوص نہیں۔ یہ نمرتا ازل ہے، ابد ہے، زماں و مکاں سے ماورا۔ اس میں ہمارے نئے عہد کا آشوب بھی ہے اور پرانے عہد کا پرسکون گہوارہ بھی۔ یہ یقینی طور پر اس عہد کی ایک ایسی دیو مالا ہے جس میں ہندوستانی فکر اور فلسفے کے سارے اسرار و رموز سمو دیے گئے ہیں۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی، ثقافتی، فکری، لسانی بر

طرح کی جمالیات کا ایک شاہکار ہے۔

پس نوشت:

'نمرتا' کے ساتھ، سات راتیں گزارنے کے بعد بھی 'نمرتا'— رموز کی لہروں میں گتھی، بے حد پُراسرار، پیچیدہ کویتا ہی لگی۔ نمرتا کا گیان پراپت کرنے کے لیے شاید یگوں پرپھیلی آنند بھری رات کا انتظار کرنا پڑے کہ کبھی میری ان سات راتوں سے وہ ایک رات آن ملے تو نمرتا کا رمز آشکار ہو جائے...

ہے نمرتا!

کب ہوگا مجھے تیرا گیان، تو کیوں روز ایک پہیلی بنتی جا رہی ہے۔ کبھی تو نزہت آفریں خوشبو بن کر میرے من میں سما جا کہ میں یگوں تلک تجھے سونگھ سکوں، تجھے سوچ سکوں... تو کیوں نہیں بنا دیتی ہے مجھے ایسا پرندہ کہ میں درشن کو ترستا بھی رہوں اور درشن بھی کرتا رہوں اور یہ مناجات پڑھتا رہوں......

نمرتا یاہ ما نمرتام گے
نمرتا یاہ ما نمرتام گے
نمرتا یاہ ما نمرتام گے

۵

تیرے بال سندر، سنورے ہوئے
تیری آنکھیں اتنی ترچھی کہ
کانوں کی لوؤں کو چھو رہی ہیں
تیرے منہ میں دودھیا دانت
قطاروں میں جڑے ہوئے
تیری چھاتیاں
موتیوں کے سندر ہار سے بجی ہوئی
پتلی لڑکی تیرا سجیلا بدن
یوں تو بالکل ساکت ہے
لیکن اس نے میرے ہردے میں
ایک طوفانی ہلچل پیدا کردی ہے

سجیلا نرمل، کومل بدن میں آخر ایسا کیا ہے جو بھرتری ہری کے ہردے میں طوفانی ہلچل مچا دیتا ہے اور من میں یہ لگن پیدا کرتا ہے......

چھوڑ ان پھیکے باسی اپدیشوں کو
مرد کو تو صرف دو چیزوں کی لگن ہونی چاہیے
بھرپور چھاتیوں والی، اس ناری کی جو کام رس کو اُبھارے
اور دل موہ لینے والے بن کی

کون ایسا تخلیق کار ہے جسے بدن مرغوب نہیں، ہمارا ادب ویدک، شعری، نثری،

بدن کے جمال سے ہی منور ہے۔ آبنوسی بدن ہر ہر سطر میں چاند کی طرح روشن ہے اور چاند بدن شب کی پرت پرت میں مخفی ہے۔ کالی داس ہو یا بھرتری، سورداس ہو یا میرابائی، شیکسپیر ہو یا بن جانسن، بودلیئر، بائرن ہو یا بہاری، کیٹس ہو یا کولرج، جے دیو ہو، یادویاپتی، چنڈی داس ہو یا امارد... کون ہے جس کے یہاں بدن کی مخفی یا ظاہر لہریں نہیں ملتیں۔ یہی بدن لہریں ہیں جو ادب کو آفاقی بناتی ہیں اور ان لہروں کا ارتفاعی عمل ادب کی لازوال سمفنی ہے۔

سنائی، عطار، عراقی، حافظ، رودکی، سبھی بدن کے اسیر ہیں۔ سلمیٰ اور لیلیٰ کے ہیجان انگیز رومانی قصوں سے عربی، فارسی شاعری بھری پڑی ہے۔ ہمارے شعور اور لاشعور پر بدن اس طرح حاوی ہے کہ ہمارا آفاقی ادب، بدن سے ہی جنم لیتا ہے اور اب یہ حقیقت مخفی نہیں رہی کہ ناری کی کوملتا اور سندرتا ہی ادب کو سندر بناتی ہے۔

میرابائی بھی ایک عورت تھی۔ اسے عورت کے بدن کا گیان تھا۔ وہ اس ترشنا سے آگاہ تھی اور اس آگ سے بھی، جو بدن کے اندر سلگتی رہتی ہے اور اسی ترشنا کی ترپتی کے لیے وہ وصال و ہجر کے مدھ بھرے گیت لکھتی ہے۔ آخر، امیر خسرو جیسے صوفی شاعر کو کیا ضرورت آن پڑی تھی یہ گیت لکھنے کی......

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

اس گیت کے بطون میں اتر کر دیکھیے تو بدن کی پیاس صاف صاف نظر آئے گی۔ ''اندھیری رتیاں'' پر غور کیجیے اور سوچیے کہ کیا رات واقعتاً اتنی ہی اندھیری ہوتی ہے... یا صرف محبوب کے فراق میں رات مہیب اور حد درجہ تاریک ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ اندھیرا، بدن سے جدائی کا اندھیرا ہے۔ دو بدن کے ملن سے رات روشن ہو جاتی ہے۔ بدن کے چراغ جلتے ہیں تو رات پُر کیف اور مست ہو جاتی ہے اور اتنی سہانی کہ جی چاہتا ہے کہ رات یہیں ٹھہر جائے، پھر کبھی سویرا نہ ہو۔ ''انگ چیناں'' پہ غور کیجیے کہ یہاں آتما پیاسی نہیں ہے بلکہ انگ میں اضطراب اور بے چینی کی لہریں ہیں اور وہ بھی اس وجہ سے

کہ بدن کا ایک ٹکڑا کہیں اور ہے اور وہ وحدت، ہم آہنگی کے لیے بے چین ہے۔

بدن، وحدت کی بہت بڑی علامت ہے اور اسی سے انسان نروان تک پہنچتا ہے۔ عورت اور مرد کے بدن دو پولز ہیں، پوزیٹو اور نگیٹو جس کے ملن سے کائنات میں سنگیت جنم لیتا ہے۔ مرد کے جلال اور عورت کے جمال ہی سے کائنات کا حسن برقرار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کلاسیکی ادب میں بدن ایک شکتی اور بے پناہ طاقت کی علامت ہے، کنول اور لنگم دونوں ہی کائنات کی شکتیوں کے مظہر ہیں۔

بدن میں اس قدر حسن اور بلاخیزی ہے کہ چاند دیوتا بھی بدن کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے بے تاب ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہیم وتی بہت کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ جب وہ سولہ سال کی تھی تو ایک دن کنول تالاب میں چاندنی رات میں نہانے گئی۔ اس کا بے لباس بدن چاند کی روشنی میں چمکنے لگا۔ چاند دیوتا اس طرف سے گزر رہے تھے، ہیم وتی کے سحر انگیز، شہوت خیز بدن کو دیکھ کر ششدر رہ گئے، اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور ہیم وتی کو مواصلت کے لیے آمادہ کرنے لگے۔ ہیم وتی جنسی ترغیبات سے مجبور ہو گئی مگر وہ اس لذت وصال کے بعد شرم سار ہو گئی اور اسے یہ خوف ستانے لگا کہ اگر کہیں اس کی کوکھ بھر گئی تو اس کی ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔ چندرما سے وہ ناراض ہو گئی اور کوسنے لگی تو چندرما نے تسلی دی اور کہا کہ اس کا بچہ کرناوتی کے ساحل پر ہوگا اور وہ بڑی مملکت کا حاکم ہوگا اور وہ کھجوراہو پر حکومت کرے گا۔ ہیم وتی کو بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام چندرورمن رکھا گیا۔

یہ ہے بدن کی جمالیاتی سحر انگیزی، جس سے ہماری پرانی داستانیں، لوک کتھائیں، ویدک گاتھائیں، بھری پڑی ہیں۔ کالی داس نے شیو اور پاروتی کے بدن کے جمال اور جلال کے وصال کا بہت ہی خوبصورت انداز میں ورنن کیا ہے اور یہ بدن کے جمالیاتی عرفان کا ایک بہت ہی روشن نقطہ ہے۔ کالی داس نے لکھا ہے کہ شیو، پاروتی کی ناف پر ہاتھ رکھتا ہے۔ پاروتی اس کا ہاتھ ہٹاتی ہے تو اس عمل میں اس کی چادر بھی ہٹ جاتی ہے اور شیو اپنی تیسری آنکھ سے پاروتی کی عریاں جمالیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس

کے اندر ایک پُراسرار، پُرلطف اگنی سے مشابہ جذبہ ابھرتا ہے، شیو اس کے ہونٹوں پر دانت کاٹتا ہے اور پستان گدگداتا ہے۔ پاروتی کو اس عمل میں مزہ آنے لگتا ہے۔ وہ شیو کو اپنے پستانوں سے کھیلنے اور ہونٹوں کو شہوانی جذبے کے ساتھ کاٹنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ اس کا حسن، شباب، بدن ایک انجانی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے پھر وہ دونوں گندھے مدان کی پہاڑیوں پر جاتے ہیں اور وہاں نہ ختم ہونے والی ''محبت کی راتوں میں'' کھو جاتے ہیں اور شاید یہی وہ محبت کی ختم نہ ہونے والی رات ہے جو کتھاؤں اور داستانوں سے ہوتے ہوئے ہمارے آج کے ادب تک پہنچی ہے اور اسی محبت بھری روشن رات کے جلو میں ہمارا آفاقی ادب تخلیق ہو رہا ہے۔

ہمارے عہد میں بھی عورتوں کو شاید اپنے بدن کا ویسا ہی عرفان اور ادراک ہو چکا ہے جیسا پاروتی کو ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ idealized body کے لیے سلیکن پلانٹیڈ بریسٹ یا breast booster کے نئے طریقے اپنانے کا جنون بڑھتا جا رہا ہے۔ اسٹین ماں اور فاکس ''دامیل ڈائکما'' میں لکھتے ہیں......

> ''لیکن آج عورتیں خود کو محض ایک جنسی شے، سے بہت افضل سمجھتی ہیں، انہیں علم ہو چکا ہے کہ ان کے جسم کی حساسیت مردانہ جسم کی بہ نسبت مختلف قسم کے شہوانی لمس (اریوجنس ٹچ) کے لیے بہت زیادہ ہے اور ان کی مباشرت کے دوران خلاص کی مدت، تعداد اور گہری مرد جتنی بھی ہے اور اس سے کافی مختلف بھی اور آج عورت کو اگر اس کی شہوانیت کے اظہار سے روکا جائے تو وہ خود کو نامکمل سمجھتی ہے۔''

شاید فیمنزم تحریک اور فیشن کے نئے چینلز اسی تکمیلیت کا اظہار ہیں یا عورتوں کی اس شہوانی قوت کا جو 'سیونی' (سو، یونی) کی شکل میں کبھی ظاہر ہوئی تھی۔

شاید مردوں کو بھی ایسے ہی آئیڈیل جسم کی تلاش رہتی ہے۔ ایک پُرکشش، لذت آمیز، مسرت آفریں، نوکیلے سر پستان والے بدن کی تلاش، شکیل اعظمی کی یہ نظم بدن کا خوبصورت ''مونتاج'' ہے......

آتے جاتے جسموں کا
نظروں سے پیچھا کرتا ہے
مزے دار کھانوں کی خوشبو
ہرے بھرے جسموں کا لمس
ذہن میں رکھے
واپس کھولی میں آتا ہے
روز کا کھانا
نئے ذائقے سے کھاتا ہے
اس کے کولہے
اس کی ٹانگیں
اس کا چہرا
اس کے بال
ایک کالی پیلی عورت میں
نتھی کر کے سو جاتا ہے

اس ہزار داستاں بدن کی داستاں عجیب ہے۔ سوچئے تو بدن دشت بھی ہے، تحیرات بھی، بھیڑ بھی ہے، تنہائی بھی، چیخ بھی ہے، سناٹا بھی، گونج بھی ہے، خاموشی بھی، بدن برف زار بھی ہے اور میدان کارزار بھی۔

ہماری اردو کی مثنویاں، بدن کے جمالیاتی عرفان کا بہترین نگار خانہ اور ''سمبھوگ رس'' کا بہترین نمونہ ہیں۔ اردو کی مثنویوں میں کہیں کرتی، انگیا، لب و دہن، رُخسار، جو بن تو کہیں بوس و کنار، مواصلت، مخالطت اور بکارت کا ذکر ملتا ہے۔ اردو کی ایسی مثنویوں کو lingeri literature کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے، جس کے بصری پیکر اب فیشن چینلز میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ملا وجہی نے جو مثنوی لکھی ہے اس میں خلوت اور بکارت مشتری کی دریدگی اور برونی کا ایسا منظر کھینچا ہے کہ آنکھیں شرما جائیں۔ میر حسن کی

مثنوی ''سحر البیان'' بھی بدن کے جمالیاتی عرفان سے منور ہے۔ میر حسن نے باریک کرتی اور پائجامے کی جھلک یوں دکھائی ہے......

وہ باریک کرتی مثال ہوا
عیاں مو بہ مو جس سے تن کی صفا
ڈھلک سرخ نیفے کی ابھری ہوئی
گلابی سی گرد ایک تہہ دی ہوئی
جھلک پائجامے کی دامن سے یوں
کہ روشن ہو فانوس میں شمع جوں

میر حسن، نجم النساء کا سراپا کھینچتے ہیں تو انہیں نوکیلی چھاتیوں کا حسن کچھ زیادہ ہی مست اور سرشار کر دیتا ہے......

بھبھوکا سا تن اور وہ منہ کی دمک
کہ جوں شعلۂ آتش سے اُٹھے بھڑک
نکیلی وہ اُٹھی ہوئی چھاتیاں
پھریں اپنے جوبن میں اترائیاں

اور یہ بیان تو اور بھی ہیجان خیز ہے......

تن نازنیں نم ہوا ان کا کل
کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل
نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک
برسنے میں بجلی کی جیسے چمک
لبوں پر جو پانی پھرا سر بسر
نظر آئے جیسے وہ گل برگ تر

بے نظیر اور بدر منیر کے بدنوں کی ہم آہنگی کا جو منظر میر حسن نے کھینچا ہے وہ ان کے بیانیہ حسن اور حسن بیان کی ایک روشن اور منور مثال ہے......

لگے پینے باہم شرابِ وِصال
ہوا نخل اُمید سے وہ نہال
لبوں سے ملے لب، دہن سے دہن
دلوں سے ملے دل، بدن سے بدن
لگی جاکے چھاتی جو چھاتی کے ساتھ
چلے ناز و غمزے کے آپس میں ہاتھ
کسی کی گئی چولی آگے سے چل
کسی کی گئی چین ساری نکل
غم و درد دامن کشیدہ ہوئے
وہ گل نارسیدہ، رسیدہ ہوئے
لگی ہونے بے پردہ جو چھیڑ چھاڑ
در حسن کے کھل گئے دو کواڑ

یہ بدن کے جمالیاتی تحرک کا ایک خوبصورت ورنن ہے۔ اسی طرح پنڈت دیاشنکر نسیم نے تاج الملوک اور بکاؤلی کی خواب گاہ میں مواصلت کا جولذت انگیز منظر کھینچا ہے، وہ بدن کے جمالیاتی تحرک اور جنسیت کا مکمل عرفان نامہ ہے۔

خواجہ میر اثر دہلوی نے اپنی مثنوی میں بدن کا بہت ہی خوبصورت جمالیاتی نگارخانہ تعمیر کیا ہے کہ ہر ہر عضو اپنے مکمل جمالیاتی زاویوں کے ساتھ بدن میں ارتعاش اور حرکت کا موجب بن جاتا ہے۔

مرزا شوق لکھنوی نے مہ لقا کے قیامت آثار قد کی رعنائی اور دل آویز جسمانی خطوط کی زیبائی اور معشوق سراپا ناز کی جلوہ گری کو یوں لفظوں کے رنگ و روپ میں ڈھالا ہے......

سینے پر دونوں چھاتیاں انمول
اونچی چکنی کڑی کراری گول

آڑی ہیکل گلے میں ڈالے ہوئے
پیاری پیاری کچیں نکالے ہوئے
گل سے رخسار گول گول بدن
گات جس طرح قمقمے روشن
قد میں آثار سب قیامت کے
گوری گردن میں طوق منت کے
رگ گل سی کمر لچکتی ہوئی
چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی
سرد سا قد گل سے رخسارے
شانے بازو بھرے بھرے سارے

اس کے بعد مواصلتی مسالک و منازل کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ جیسے خواب گاہ میں کوئی کیمرہ فٹ ہو... یہ معاملہ صرف مثنوی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ عالمی ادبیات، آرٹ ہر ایک میں بدن کے جمالیاتی مظاہر نظر آتے ہیں۔

اردو میں بہت ساری جسم جمال کہانیاں، بدن وصال نظمیں لکھی گئی ہیں۔ کہانیوں میں جو بدن ابھرتا ہے، وہ اپنے جمال سے قاری کو نہال کر دیتا ہے۔ گیان سنگھ شاطر بدن کے بہت بڑے گیانی ہیں۔ اردو کے ایک ایسے ناول نگار جنہوں نے ایک خودنوشت سوانحی ناول ''گیان سنگھ شاطر'' لکھا اور ساہتیہ اکاڈمی کے انعام سے سرفراز ہوئے۔ ان کے اس ناول میں بھی بدن کے جملہ نشیب و فراز کا بڑا خوب صورت منظر نامہ ملتا ہے۔ پیٹ کے اوپر کا ہرا ابھرا منطقہ ہو یا نشیب کی زرخیز زمین، گیان سنگھ نے زمین کے باطنی اور خارجی مظاہر کا بہت ہی فسوں خیز بیانیہ تحریر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔ ''ان مہکتی چہکتی دوشیزاؤں کے سینے کی گھاٹیاں اور کمر کی وادیاں وہ عشرت گاہیں ہیں جہاں پوری عمر ایک کروٹ میں بسر کی جا سکتی ہے۔'' اس کے خیال میں انزال تو اندرونی وجود کا باہری وجود سے وصال ہے اور یہ ایک سراسر جمالیاتی تجربہ ہے اور اس

طرح کے تجربوں سے شاطر کا پورا ناول سرشار نظر آتا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے......

''... گردن کے دونوں طرف کی رگیں اتنی تحریک خیز تھیں کہ ان پر ہونٹ رکھتے ہی ترنگ اُٹھتی کہ انہیں چبا کر اس نمک کو نچوڑ لوں جو بدن سے زیادہ ان میں بہتا تھا۔ اس کے پستان دنیائے حسن کے سب سے زیادہ خوبصورت اور تندرست باشندے تھے۔ ان کے اثر سے اس کا چھریرا بدن تھوڑا آگے کو جھکا رہتا تھا... وہ کہیں پاؤں اٹھا کر چلتی تو ناز کی لیکن استواری سے آگے پیچھے لہراتے ہوئے پستان ان خط و خال کو عیاں کرتے جو نہاں ہوتے ہوئے تسکین نفس کی جائے اماں تھے... اس کی نشاط کے آخری مراحل میں، میں اس کے اندر گہرا اُتر جاتا۔ وہ لذت انگیز اذیت سے بڑبڑاتی اور دانت بھینچ کر کہتی۔ ''بس بس اندر اور جگہ نہیں ہے...''

کچھ ہی دنوں میں اس کی چھاتی پہلے سے زیادہ پوری، جلد ملائم، آنکھیں خواب آگیں، ہونٹ تازہ اور رنگ سنہرے کنول کی طرح چمکنے لگا۔ سانس گلاب جل میں نہائی ہوئی ہوا کی طرح مہکنے اور دور سے حواس پر اثر انداز ہونے لگی جیسے آگ کو ظہور پذیر ہونے کے لیے حرارت چاہیے۔''

بدن کی یہی تازگی بخش حرارت ہے جس کا اظہار فراؔق نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی ہے

فراؔق گورکھپوری کا یہ شعر بھی بڑے کمال کا ہے۔

بہرحال گیان سنگھ شاطر نے اس دوشیزگی جمال کی دریدگی کے بہت سارے مناظر اپنے ناول میں پیش کیے ہیں۔ ایک منظر ملاحظہ ہو:

''اس نے چوٹی کھول کر بال جھٹکے اور شانوں پر پھیلائے، انہیں پوری طرح بھگو کر اس نے جوڑا باندھا جس سے گردن لمبی اور ماتھا کشادہ دکھائی دینے

لگا۔ گردن سے سینے کے مخروطی سرے تک اور وہاں سے پیٹ تک کا جو
زاویہ بنتا تھا، اس کے پیکر کا سب سے دلکش حصہ تھا۔ وہ بدن کرتے کے
اوپر سے ملتی جو بدن کے اُتار چڑھاؤ میں کہیں ڈوبتا اور کہیں ابھرتا۔ سینہ دو
مخروطی چٹانیں نظر آتا اور کبھی غیر ہموار لیکن پراسرار انبار... ہلکے سے جھکے
ہوئے ممے، ان کی چوٹیوں پر رجھاتے ہوئے کتھئی دائرے، ان کے بیچ
براجمان سندر گنبدوں جیسی ابابیلوں کے پیارے مکھڑے، سینے اور پیٹ
کے خوبصورت زاویے، صاف شفاف پردے، کولہوں کی مرغوب قوسیں،
چڈھوں میں تحقیق انگیز تکون، اجلی رانوں کے درمیان دھندلی لکیر... وہ
تمام مقدس حسن، بیک وقت میری آنکھوں میں سما گیا... میرے خون کا
دباؤ بڑھنے لگا اور اعضاء کا رویہ بدلنے لگا۔ اس کی عریانی نے میرے
اعصابی نظام میں ہلچل مچادی۔ میں نلکا چلاتا چلاتا، رک گیا لیکن نلکے کے
ہینڈل سے ملتی جلتی حرکت میرے کاچھے میں شروع ہوگئی۔ میری وارفتگی
جینا نے دیکھی، اچانک وہ چھپاک سے اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی، پھر میں
کچھ نہ دیکھ سکا اور نہ کچھ سمجھ سکا، بس اتنا محسوس کرسکا کہ میں اس کی گہرائی
تک اس کے اندر تک اتر گیا ہوں جہاں وہ پانی سے الگ نیم گرم تیل کی
طرح گیلی ہے...''

ظاہر ہے کہ یہ سارے واشگاف جنسی بیانات ہیں جن کا تعلق سیکس سے ہے مگر
گیان سنگھ شاطر کی نظر میں یہ معاملہ ایروز اور جمالیات کا ہے۔ اس کا کہنا ہے۔ ''ماں
باپ اپنے بچوں کو ہر ہنر سکھاتے ہیں لیکن عضو تناسل کی تہذیب سے بے بہرہ رکھتے
ہیں۔ وہ اس کے بارے میں ازخود سیکھتے ہیں اور کمال حاصل کرتے ہیں چونکہ عضو تناسل
کی تہذیب افزائش ہے۔ یہ عبارت اور اشارات کی گرفت سے باہر ہے... یہ تہذیب
اپنے آپ میں مکمل ہے، اس لیے بڑی شوخی سے کاشف ذات میں سرگرم ہے۔ یوں نہ
ہوتا تو انسان اس تہذیب سے چشم پوشی کرتا اور انجانے میں فطرت کے تخلیقی کام میں

رُکاوٹ ڈالتا۔ میں عضو تناسل کی نعمت غیر مترقبہ سے محظوظ ہوا اور محسوس کیا کہ میں پہلا آدمی ہوں جس نے اس کا پُراسرار کردار دریافت کیا ہے۔ میں ایسا نہ کرتا تو یہ اپنی خوبی سے بے خبر گوشت کے ذلیل لوتھڑے کی طرح گوشۂ حقارت میں پڑا نابود ہو جاتا۔''

گیان سنگھ شاطر کا یہ بیان اپنی حد تک تو صحیح ہے مگر کشف ذات کی تہذیب اور عضو تناسل یعنی ''ذِکر ذَکر'' کے پُراسرار کردار کی دریافت کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ اس کا رشتہ ہندو اساطیر سے ہے جہاں شیو کا لنگم، کائنات کی زرخیزی اور پاروتی کی ''یونی'' شکتی کی علامت بن کر پوری کائنات کے کینوس پر پھیل جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ وشنو اور شیو ''دیودار'' کے جنگل میں گئے تاکہ وہاں سادھوؤں اور ان کی بیویوں کے جنسی درجہ حرارت کا اندازہ لگا سکیں، وشنو نے اپنے آپ کو ایک خوبصورت دوشیزہ کی شکل میں ڈھال لیا اور شیو نے ایک ننگے آدمی کا روپ دھارن کر لیا۔ سادھوؤں کے بیٹوں نے خوبصورت دوشیزہ سے چھیڑ خانی شروع کر دی اور ادھر سادھوؤں کی بیویاں اور بیٹیاں شیو کے ننگے بدن کو دیکھ کر ہیجان خیز ہو گئیں۔ سادھوؤں نے جب یہ حال دیکھا تو انہوں نے انہیں سبق سکھانے کی سوچی۔ وشنو تو بھاگ گئے لیکن شیو جی کو سادھوؤں نے پکڑ لیا اور ان کے لنگم کو کاٹ دیا اور یہ لنگم زمین پر گرا، مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آسمان کی طرف بڑھتا چلا گیا...

۶

ایک بجلی کی کوند ہم نے دیکھی
اور لوگ کہیں ہیں وہ بدن تھا

گورے بدن کا اس کے عالم میں رات دیکھا
ایک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر

باندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

رنگینی بدن کا کروں کیا بیان کہ ہائے
اک تہہ گلابی سی ہے ترے پیرہن میں روز

صاف چولی سے عیاں ہے بدن سرخ ترا
نہیں چھپتا تہہ شبنم چمن سرخ ترا

بدن بہار ہے، جام ہے، شراب ہے، نور ہے، کیف ہے، سرور ہے، اک جاگتی ہوئی رات ہے، بیدار سحر ہے، آگ ہے، پانی ہے، پہلی کہانی ہے، تخلیق کا استعارہ ہے... بدن ایک شکتی ہے، طاقت ورلہر ہے، اس کی 'موج تہہ نشیں' میں تخلیق کا سارا رمز مضمر ہے۔ بدن ایک نسخۂ کیمیا اور ایک ایسا نشہ ہے کہ اس کے ذرا سے لمس سے بوڑھے اپنی جوانی کی جون میں پلٹ آتے ہیں، بدن بہت ہی انرجیٹک ہے جو منجمد خون کو بھی

سیال کر دیتا ہے......

"عورت کے جوان جسم سے دھواں اُٹھ رہا تھا، اچانک اس نے انگڑائی لی اور بوڑھے کو اپنے بازوؤں میں اس طرح سمیٹ لیا کہ جیسے مرغی چوزے کو اپنے پیروں میں سمیٹ لیتی ہے اور پھر حیرت انگیز طور پر بوڑھے کی منجمد رگوں میں سیسہ پگھلنے لگا، جذبات کی آندھی اسے بہت دور تک تاریک گپھاؤں میں لے گئی جہاں بے کنار لذتیں اس کی منتظر تھیں۔"

(سرد خانے کا آدمی— فیاض رفعت)

بدن کی اس 'شعلگی' اور 'حرکی توانائی' کا احساس اس فارسی شاعر کو بھی تھا جس نے یہ شعر کہہ کر اپنی حسرتوں کے کوہ البرز کو پگھلانے کی کوشش کی......

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر
کہ سحر گہ زکنار تو جواں بر خیزم

(ہر چند میں بوڑھا ہوں بس تو کس کر مجھے آغوش میں بھینچ لے تا کہ میں صبح کو تیرے پہلو سے جوان ہو کر اُٹھوں...!)

یہ ہے بدن کی مسیحائی اور اسی لیے بدن سب سے اعلیٰ و ارفع قوت ہے کہ گلشن کا ہی نہیں، پوری کائنات کا کاروبار اسی سے چل رہا ہے۔ کائنات کا سب سے بڑا محور بدن ہی ہے اور آج کی تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا، صارفیت زدہ سماج نے 'بدن' کو سب سے بڑی طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے۔ اتنی بڑی شکتی کہ بڑے بڑے دریاؤں کا رخ بھی موڑ سکتی ہے۔ بلند و بالا پہاڑوں کو پگھلا سکتی ہے، دیوی دیوتاؤں کی پوجا بھی اسی بدن کی شکتی کا اعتراف ہے، مسیحی شبیہیں بھی بدن کی قوت کا اظہار یہ ہیں۔ بدن ایک بڑی طاقت ہے اگر یہ طاقت ختم ہو جائے تو کائنات کا تسلسل ہی ٹوٹ جائے۔ مگر یہ اتنی بڑی شکتی ہے کیا چیز...؟ اسے آج تک کوئی نہ جان سکا! بدن ایک پُر اسرار کائنات ہے جس کی مکمل سیر کوئی نہ کر سکا، بدن ایک مسٹری ہے جس میں پوری دنیا کھوئی ہوئی ہے۔ بدن یاتری تھک ہار کر آخر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ......

''جسم محض بستر نہیں، جسم ایک چھوٹا سا گاؤں بھی ہے اور وسیع شہر بھی، جسم ہمالیہ بھی ہے اور بگولے اڑاتا ریگستان بھی، جسم جنگل بھی ہے اور خواہشوں کا آباد نگر بھی۔ (خوشبو بن کر لوٹیں گے — دیویندر اسر)

صدیوں سے ہم جسم کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں، مگر ہمیں جسم کا پتہ نہیں ملتا کہ جسم طلسمات کی وہ نگری ہے جہاں انسان اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے۔ اپنی آنکھیں، اپنے چہرے چھوڑ آتا ہے... اس طلسم نگری کی اگر کسی نے سیر کی ہے تو وہ ہے واتسائن۔ بنارس جیسے مقدس شہر میں دینیات کا طالب علم واتسائن، جس نے جسم کے خوب صورت خواب جزیرے تلاش کئے اور human sexuality کا کلینکل اور اکتشافی مطالعہ پیش کر کے پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ کام سوتر، بدن کی جمالیات کا ایک صاف شفاف آئینہ ہے، یہ چین اور جاپان کے erotic لٹریچر کی طرح نہیں ہے جو مکمل طور پر بدن پر مرتکز ہے اور اس میں دوسروں کی بیویوں سے بھی مباشرت کے آداب بتائے گئے ہیں بلکہ یہ وہ eroticism ہے جس کا رشتہ روحانیت اور اخلاقیات سے بھی جڑا ہوا ہے۔ جس میں صرف بدن نہیں، آتما بھی ہے۔ کھجوراہو آج بھی ہمارا ایک تہذیبی، جمالیاتی استعارہ ہے کہ وہاں کے پتھروں پر منقش برہنہ مباشرتی مجسمے آلات خیزی نہیں کرتے بلکہ سیکس کے تئیں تقدس کا احساس جگاتے ہیں اور یوں بھی ہمارے یہاں تجرد، رہبانیت گناہ ہے، سیکس نہیں، جنت کی خوبصورت حوروں کا تصور بھی دراصل اسی سیکس کا مظہر ہے اور قرآن کریم میں 'کواعب اترابا' یعنی متناسب پستانوں کا ذکر بدن کے اسرار اور اس کی جمالیاتی پیکر تراشی کا ایک خوبصورت اشاریہ ہے۔

بدن کی جمالیات کا ادبی اظہاریہ eroticism کا سیاق و سباق اور کینوس بہت وسیع اور لامحدود ہے۔ دنیا کے ہر ادب اور زبان میں اس کی مثالیں ملتی ہیں مگر بہت ہی محدود مفہوم اور چھوٹے کینوس میں۔ عربی میں امرؤ القیس کی ایروٹک شاعری آج بھی مقبول ہے۔ جب وہ دار جلجل کے تالاب میں نہاتی، ننگی لڑکیوں کے کپڑے چھپا لیتا ہے تو

وہ اس شرط کے ساتھ کپڑے واپس کرتا ہے کہ وہ پہلے جسموں کے نشیب و فراز، بین السطور کا مشاہدہ کرے گا۔ اس کی یہ خواہش پوری ہوتی ہے... اور پھر وہ بدن کے جمالیاتی زاویوں کو نچوڑ کر اپنی شاعری میں خوب صورت تشبیہات، استعارات کے چاند ستاروں سے سجا دیتا ہے۔

مهفهفة بيضاء غير مفاضة
ترائبها مصقولة كسجنجل

......اور یہی شاعر یہ بیباکانہ اقرار بھی کرتا ہے کہ......

''میں تم جیسی کتنی حاملہ اور دودھ پلاتی حسیناؤں کے پاس گیا ہوں۔ جب میں ان میں سے کسی کے پاس ہوتا ہوں تو وہ اپنے ایک سالہ بچے سے بھی غافل ہو جاتی ہے۔''

''جب اس کا بچہ رونے لگتا ہے تو وہ سیدھی ہو کر اپنے سینے کا ایک حصہ اس کی طرف کر دیتی ہے اور دوسرا حصہ جوں کا توں میرے نیچے رہتا ہے۔''

اموی دور کا عمر بن ابی ربیعہ بھی ایک ایروٹیک شاعر تھا، اتنا بڑا کہ پردہ نشین عورتوں کے لیے اس کے اشعار سننے کی مناہی تھی کہ اگر وہ شعر سن لیتیں تو جسم کے سارے کپڑے چاک کر کے جوان بانہیں تلاش کرنے لگتیں۔

عباسی دور کا ابونواس بھی نرم شانہ لونڈوں کے مخمل دو خوابہ، سبزہ نو خطاں کی مستانہ اداؤں اور بھاری بھر کم کولہوں کا ذکر کر کے ایک سنسنی سی پھیلا دیتا ہے۔ یہ homo-eroticism کی اعلیٰ مثال ہے۔ یہ سارے ایروٹک شاعر تھے جو اپنے زمانے میں بھی مقبول تھے اور آج بھی ان کا جادو سر چڑھ کو بول رہا ہے۔ انہوں نے بدن کی شاعری کی، خواہ بدن مرد کا ہو یا عورت کا۔ دونوں ہی بدن میں جمال ہے۔ مردانہ جسم کا حسن نناشا جینی کے آرٹ میں نمایاں ہے۔ انہوں نے مردوں کے برہنہ جسم کی مصوری کی اور یہ اعتراف کیا کہ مرد کا جسم قابل ستائش اور جمالیاتی سطح پر تسلی بخش ہے، اور گوتم کی بیوی نے کہا۔ ''اے میرے پتی، تیرے ہونٹ آلوچوں کی طرح گلابی ہیں۔''

فارسی میں حافظ شیرازی کے ہاں 'ضعف باہ' کے باوجود بدن کی آنچ سے حرارت کشید کرنے کا جذبہ ملتا ہے......

نهاني الشيب من كل العذارى
سوى تقبيل خدوا اعتناقي

(بڑھاپے نے مجھے ہر باکرہ لڑکی کے وصال سے روک دیا ہے۔ رخسار کا بوسہ اور گلے لگانے کے سوا میں کیا کر سکتا ہوں......)

پھر بھی حافظ اپنی شاعری میں یخ بستہ ٹھنڈے وجود کے ساتھ گرم جسم اوڑھنے کی بات کرتے ہیں۔ مولانا روم کی مثنوی جسے ہست قرآن در زبان پہلوی کہا جاتا ہے، میں بھی جسم کا خوبصورت بیانیہ ملتا ہے۔

اردو والوں نے بھی جسم کی وادیوں کی سیر کی مگر وہ ہمالیائی بلندی طے نہ کر سکے۔ وہ تو کسی کی مست آنکھوں میں کھو گئے، تو کسی کی زُلف دراز کے اسیر ہو کے رہ گئے، لولیان شوخ شیریں کے یاقوتی ہونٹوں میں الجھ کر رہ گئے، کسی مہ جبیں کی گرمی رخسار سے جل گئے، پھر بھی ''بدن کی کچی آنچ'' میر تقی میر کے ہاں ملتی ہے، مصحفی کے ہاں، غالب کے ہاں، امیر مینائی کے ہاں، ن۔م۔راشد کے ہاں، میراجی کے ہاں۔بس فرق یہ ہے کہ کہیں آنچ کم ہے، کہیں زیادہ۔

بدن کے جمالیاتی زاویوں کو میر نے ایک الگ رنگ سے دیکھا، انہوں نے جسم کے نہاں خانوں کی سیر کی تو انہیں بدن کے جو روشن یا دھندلے مناظر نظر آئے، انہیں شاعری کے کیمرے میں یوں قید کیا کہ بدنیت ان کی شاعری میں 'ابدیت' کا استعارہ بن گئی......

ہائے لطافت جسم کی اس کے مر ہی گیا ہوں پوچھو مت
جب سے تن نازک وہ دیکھا تب سے مجھ میں جان نہیں

لطف اس کے بدن کا کیا کہوں میرؔ
کیا جانئے جان ہے کہ تن ہے

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہہ جس کی پیرہن پہ ہے

کیا لطف تن چھپا ہے میرے تنگ پوش کا
اگلا پڑے ہے تن سے اس کا بدن تمام

جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے
کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ

وہ سیم تن ہو ننگا تو لطف تن پہ اس کے
سو جی کیے تھے صدقے یہ جان و مال کیا ہے

مصحفیؔ کے ہاں بھی 'بدنیت' اپنی تمام نزاکت اور لطافت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مصحفیؔ نے بدن کو جس جمالیاتی حس سے دیکھا ہے، اس نے بدن میں ایک مضبوط اور طاقتور لہر کا احساس دلایا ہے۔ مصحفیؔ کے ہاں بدن کے جمالیاتی رنگ کچھ یوں ہیں......

کون آیا تھا نہانے لطف بدن سے جس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش ہوگیا ہے

محتاج عطر کب ہیں وہ پیرہن بتاں
جوش عرق سے جن کی مہکتی ہیں چولیاں

جس وقت کہ دیکھا ہے کھلا یار کا سینہ
اے مصحفیؔ ہم لطف سحر بھول گئے ہیں

ہر چند کہ تھا قابل دیدن بدن اس کا
پر آنکھ نہ ٹھہری جو کھلا پیرہن اس کا

جبکہ پھرتا تھا بدن پر ترے پیار سے اس کا ہات
تھرتھراتی تھی پڑی جوں موج دریا تری گات

بکھری لٹوں میں اس کا یہ عالم ہے دلفریب
ہوں جوں اساوری میں کئی مار کی شبیہ

لکھنا کمر کا اس کی علاقہ سریں کے ساتھ
اک مو سے کھینچی ہے دو کہسار کی شبیہ

غالبؔ کے ہاں جسم کا تقدیسی رنگ ہے۔ جنس کے ارتفاع کی مثالیں ان کی شاعری میں آسانی سے مل جاتی ہیں......

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

غنچہ ناشگفتہ کو دُور سے مت دِکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

صلاح الدین پرویز نے غالبؔ کے لیے جو سات نظمیں لکھی ہیں، ان میں غالبؔ کی اسی جنسی سائیکی کی طرف اشارے ہیں اور یہ نظمیں غالبؔ کی شخصیت کے اس نئے بعد کو مکمل آئینہ دکھاتی ہیں......

تیری زُلفیں جو مہکتی ہیں میرے شانوں پر
مجھ کو اک رات کی رانی کا خیال آتا ہے

تیری آنکھیں جو چھلکتی ہیں مری باتوں پر
مجھے اِک ابر بہاراں کا خیال آتا ہے
چھیڑتی ہے یہ صبا جو غم فرقت کی قیص
تیری انگشت حنائی کا خیال آتا ہے
پھر خیال آتا ہے میں تجھ سے کہوں
چھوڑ آرائش کاکل، میری بانہوں سے لپٹ
آ ستم گر مرے پاس آ، میرے پہلو میں سمٹ
آ ترے پاؤں کو بوسوں کے پنہا دوں بچھوے
پاؤں کیا ہیں! میں ترے پاؤں کے تلوؤں کو بھی
اپنے بوسوں سے رگڑ دوں، مل دوں
ایک رگ جاتی ہے جو ترے انگوٹھے سے
ترے دل کی طرف
میں وہاں تک لئے جاتا ہوں بوسوں کی قطار
اب تو آرام سے کر بجۂ آتش کا شمار
ایک زرتار سی ڈوری میں اسیر
جو کمر میں تری رہتا ہے فقیر
کھول دیتا ہوں وہ قفل کمر بند ترا
ایک بوسے بھری چابی سے ابھی
جسم کو چین نہ لینے بھی دے گا کمخواب
لا اتاروں میں اسے اور پہناؤں تجھ کو
اپنے بوسوں سے تمنائی ہوئی چاہ حریر
ہائے یہ کیوں ہوا کیسے ہوا

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ اسد
آ گئی ہاتھ میں جانے کیسے
تری جالی کی وہ چھوٹی سی معطر سی شمیز
جن میں پنہاں ہیں تری بلبلیں تھوڑی سی دبیز

واتسائن کے کام سوتر کو اس کی مکمل معنویت اور تہذیبی سیاق وسباق کے ساتھ re-create کرنے والے شاعر صلاح الدین پرویز نے eroticism کی اس روایت کو اردو شاعری میں بحال کیا جس کی بنیاد واتسائن نے ڈالی تھی۔ جس نے کام سوتر کا شعری کاؤنٹر پارٹ لکھ کر یہ احساس دلایا کہ ایروٹسزم بدن سے نکل کر آتما کی اشتہاء بجھانے کا نام ہے۔ وہ محمد علوی کی......

بڑے بڑے پستانوں پر
سر رکھ کر
گہری نیند میں کھو جاؤں

......جیسی شاعری سے مختلف ہے۔ صلاح الدین پرویز نے ایسے جسموں سے ماورا جسم کی دریافت کی ہے جو پوری کی پوری آتما ہے، اس کی شاعری کے بدن کا رشتہ شہوانی جذبات سے نہیں، جمالیات سے ہے، ایروز سے ہے۔ ان کا بدن مرتا نہیں ہے بلکہ امر ہو جاتا ہے کہ یہ بدن رادھا کا بدن ہے۔ طلائی کلس کی طرح چھاتیوں کے زہد شکن ابھار اور ہاتھی کی سونڈ کی طرح خوشنما گداز رانوں کا ذکر بھی اتنی خوب صورتی سے ملتا ہے کہ خیزی نہیں ہوتی، انہوں نے بدن کی تہذیبی و جمالیاتی حسیت کا مکمل ادراک کیا ہے......

تم نے سر پہ اپنی چنری کے پلو کو ٹھیک کیا تھا
پھر جانے کیا سوچ کے تم نے اپنا پلو کھینچ کے نیچے
دونوں مندر ڈھانپ لئے تھے

جب تو ململ کا کرتا پہنے یوں ہی میرے ساتھ

سیر کو نکلے

تو تیرا کرتا، تیرا ململ کا کرتا

ترے چمپئی بدن سے چپک جائے

سب نظر آنے لگے... سب

سفید مخملوں سے ڈھکے ہوئے گنبد

گلابی کم خواب پہنے ہوئے مینار

مندر، گنبد، مینار کو کیا آپ شہوت بھری نظروں سے دیکھ سکتے ہیں؟ عشق کی آنکھ سے، محبت اور تقدس کی نظر سے ہی یہ ساری چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ اس طرح صلاح الدین پرویز نے اپنی ایروٹک شاعری میں تقدیس کی چمک پیدا کی ہے۔

ادب ہو یا آرٹ، بدن کو ایک مرکزیت حاصل رہی ہے۔ بدن ہی ایک کلیت ہے جس کا اظہار آرٹ کی مختلف شکلوں میں ہوا ہے۔ رقص ہو یا موسیقی یا مصوری، سبھی بدن کی لہروں، ارتعاشات کا اظہاریہ ہیں۔ بدن کی کلیت کی وجہ سے بہت سارے مذاہب اس کے محور پہ رقص کناں ہیں۔ سراج منیر نے ایک جگہ لکھا ہے......

''عیسوی تہذیب میں آرٹ کی بنیادی شکل صوری ہے اور اس کی بنیادی فنی ہیئت حضرت عیسیٰ کی شبیہ سازی ہے mystery of the body کو دریافت کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ اس کے گرد میڈونا کی شبیہ سازی کی روایت پیدا ہوئی... جسمیت کو سمجھنے کی اسی کوشش نے قرونِ وسطیٰ کے گرجوں کے بھاری بھرکم ڈھانچے پیدا کئے... فن کی بہت منقلب ہوتی ہوئی شکلوں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک ہی چیز مشترک ہے 'جسم'۔

''مغربی معاشرے میں آرٹ کا بنیادی فریم جسم میں تقدیس و تعذیب کے متضاد رجحانات کی بیک وقت موجودگی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے آخری عرصے

اور احیائے علوم کے ابتدائی دور میں داؤنچی اور انجلو کے ہاں جسم انسانی کی بناوٹ اور اس کے اسرار سے جو غیر معمولی دلچسپی دکھائی دیتی ہے اور اس کی شبیہ سازی میں اتقان کی جو تلاش ہے، وہ ہمیں مغربی آرٹ کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہے۔''

یہاں اس حقیقت کا ادراک بہت ضروری ہے کہ مساجد، منادر، گرجا گھر یہ سب ہمارے جسمانی مظاہر ہیں۔ ان کی شکلیں انسانی اعضاء سے ملتی جلتی ہیں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اس حقیقت کو کچھ یوں روشن کیا ہے......

''دنیا کی تمام عظیم عمارتوں میں اقلیدسی صورتیں، انسان اور اس کے سماج کی قدروں اور جنسی اور داخلی کیفیتوں کو کسی نہ کسی طرح سمجھاتی ہیں۔ قدیم ہندوستانیوں نے اپنے باطنی ہیجانات کو عمارتوں کی صورتوں میں ڈھال دیا ہے... اٹھے ہوئے ستون، مینار، مندر، سب انسان کے اپنے وجود کی علامتیں ہیں جو آسمانوں سے رشتہ قائم کرتی ہیں۔''

رقص جسے ہندوستانی جمالیات کا ایک بڑا سرچشمہ کہا جاتا ہے اس میں خوبصورت، پرکشش، لذت آمیز جسموں کے ارتعاشات، محرکات سے ہی کیف و سرمستی کی فضا خلق ہوتی ہے۔ جذب وجنون کا ایک جہاں وجود میں آتا ہے۔ ایک عالم سکر کی تخلیق کا سبب وہی بدن ہی بنتا ہے جس کی لہروں میں فنا اور بقا دونوں مضمر ہیں۔ یہی بدن کا رقص ہے کہ جس کی وجہ سے گھنگھروؤں پہ رات ٹھہر جاتی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے ہندوستانی جمالیات کے نگار خانہ رقص کو یوں منور کیا ہے......

''ہندوستانی افکار و خیالات میں رقص جہاں پرش اور پراکرتی کا والہانہ متحرک اور مترنم اظہار ہے، وہاں سیکس کے اعلیٰ و ارفع جذبوں کا اظہار بھی ہے۔ سیکس کی جبلت کے آہنگ کا والہانہ اظہار آنکھوں، انگلیوں، چھاتیوں، بازوؤں اور پاؤں کی متحرک کیفیتوں سے ہوتا ہے۔ رقص میں جنسی اظہار جہاں حد درجہ لذت آمیز ہے، وہاں یوگ کی اعلیٰ ترین سطح کا شعور بھی ہے۔

جنسی جذبوں اور تجربوں کا اظہار انسان کے پورے وجود کا لطیف تر اظہار بن گیا ہے۔''

رقص جہاں بدن کی جمالیات کا خوبصورت منظر نامہ پیش کرتا ہے اور بدن کے سارے جمالیاتی تحرکات وارتعاشات رقص میں ہی اُجاگر ہوتے ہیں تو وہیں بدن کے جمالیاتی مظاہر کا مکمل آئینہ دار وہ مصوری ہے جس میں دل آویز جسمانی خطوط، مکمل جمال کے ساتھ ہویدا ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے مصوروں نے جسم کو ایک عنصری حیثیت سے اپنی تصویروں میں پیش کیا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آرٹ ورلڈ کا سارا ارتکاز بدن ہی پر ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر اب تک کی مصوری میں سارا جمال وجلال بدن کا ہی ہے۔ پدما، کملا، یا لکشمی کے عریاں پیکر ہوں یا سانچی کی ایستادہ عورت، سبھی میں ابھری ہوئی چھاتیاں، ناف اور عضو مخصوص کو جاذب نظر دکھایا گیا ہے۔ چھاتیاں جو عورت کا شناس نامہ ہیں، اس کو تمام مصوری میں اور نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے کہ یہی وہ انگ ہے جو انسان کی پرورش کا ضامن بھی ہے اور لذت کشید کرنے کا ایک ذریعہ بھی، ایسا ہی حال عضو مخصوص کا ہے جو تخلیق کا سرچشمہ بھی ہے اور لذت کا بحر ذخار بھی، انسان کی تخلیق و پرورش میں انہی دو اعضاء کا کلیدی کردار رہا ہے مگر انسان ان ہی دونوں پر سب سے پہلے یلغار کرتا ہے تو اس کی وجہ وہ فطری مقناطیسی کشش ہے۔

پرانے زمانے کی مجسمہ سازی میں بھی ''بدن کی حرکیات'' کا جو جمالیاتی منظر نامہ ترتیب دیا گیا ہے، وہ بھی اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بدن ہی ہر شے کا سرچشمہ ہے۔ بدن کے بغیر کسی شے کا وجود ممکن نہیں۔ ''میتھن مجسمہ سازی اس کل اور کلیت کا علامتی اظہار ہے کہ جب دو بدن ملتے ہیں تب وجود مکمل ہوتا ہے۔ چین کے فلسفے میں یانگ (مرد) ین (عورت) کے بغیر کسی چیز کا وجود ممکن ہی نہیں۔ گویا بدن ایک تلاش ہے جس کے لیے دو کنارے سرگرداں رہتے ہیں اور جب دونوں مل جاتے ہیں تو وجود مکمل ہو جاتا ہے۔''

وجود کی تکمیل بدن کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے بدن سب سے بڑی شکتی اور قوت

ہے اور اسی بدن میں نہاں ہے سارا آنند جس کے لیے انسان پریشان ہے۔ شیو، پاروتی، گوری اور کالی کے آسن اس کی معنی خیز علامتیں ہیں۔

پربھوداس گپتا کی the women بھی بدن کی جمالیات کی فوٹوگرافک تعبیر وتشریح ہے۔ جن ۹۰ عورتوں کے دل آویز جسمانی خطوط کی عکاسی ان میں کی گئی ہے، ان میں زیادہ تر وہ عورتیں ہیں جو اپنے بدن کا جمالیاتی ادراک رکھتی ہیں۔ انہیں اپنے نشیب وفراز، سدرۃ المنتہیٰ اور تحت الثریٰ کی شکتیوں کا بھرپور احساس ہے اور انہی جمالیاتی احساس کا خوبصورت مرقع ہے، پربھوداس کی وہ کتاب جس پہ کافی ہنگامہ بپا ہوا اور ان کی asthetic nudes کی منطق کو مسترد کرنے کی مکمل کوشش کی گئی جب کہ ان کا یہ کہنا ہے کہ سیکس اور nudity کا ہماری روحانیت سے بہت گہرا رشتہ رہا ہے اور ایروٹیک آرٹ کی روایت بہت پرانی ہے yakshini اسکلپچر میں بھاری بھرکم کولہوں اور بڑے بڑے پستانوں پر زور اس بات کا اشاریہ ہے کہ بدن کے یہ دو انگ بہت معنی خیز جمالیاتی استعارے ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ مصور مقبول فدا حسین نے بھی بدن کی جمالیات کو اپنے آرٹسٹک نظریے سے اُبھارا ہے اور ہندوستان کے نسائی پیکر کو پینٹ کیا ہے کہ ان کے خیال میں عورت ہی اصل شکتی ہے۔ رادھا کے بدن کی حرکیات میں ہندوستان کا تہذیبی نسائی جوہر چھپا ہوا ہے۔ ایم۔ ایف۔ حسین کو بدن کی شکتی کا بھرپور احساس ہے اسی لیے انہیں مادھوری کے کولہوں کی جنبش میں بھی ایک تقدس نظر آتا ہے۔

دُنیا بھر کے آرٹ اور ادبیات کے منظرنامہ پر نگاہ ڈالئے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ پوری دنیا کا ادب جسم کے محور پہ مرتکز ہے اور چونکہ یہ قاری اساس عہد ہے اس لیے قاری کی اہمیت کو پیش نظر رکھا جائے تو انہیں وہ شاہکار اچھے لگتے ہیں جن میں جسمانی ارتعاشات اور بدن لہروں کا خوبصورت بیانیہ ہو۔ لارنس کی لیڈی چٹرلیز لور کی شہرت کی بنیاد بھی وہ بدن آشنائی ہے جس میں لارنس نے لذت طرفین کے نسخے بتائے ہیں۔ ناباکوف کی 'لولیتا' آج بھی ایک مقبول عام ناول ہے۔ جیمس جوائس کی

'یولیسیز' کی شہرت بھی اسی حوالے سے ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج انٹرنیٹ اور سائبر اسپیس اسٹیج میں بدن، شاعری اور فکشن کی تفہیم کا سب سے بڑا حوالہ بن گیا ہے۔ ایم۔ ٹی۔ وی، ایف۔ ٹی۔ وی، وی چینل پہ جو نغمے سنائے جاتے ہیں۔ وہ بدن میں گوندھ کر سنائے جاتے ہیں اور جسمانی حرکات و اشارات اور اداؤں کے ذریعہ شاعری کا ایک بیک گراؤنڈ اور منظر نامہ پیش کیا جاتا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ بدن اور جنس سے کسی بھی ادب یا آرٹ کا فرار ممکن نہیں کہ بدن ہی سب سے بڑی حقیقت ہے اور یہی کائنات کی کلیت ہے۔

"جنس کی ہمہ گیری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ عورت مصوری اور مجسمہ سازی کا ہمیشہ ایک دلکش موضوع بنی رہی۔ یونان کے قدیم مجسموں اور اجنتا کی دیواری تصویروں میں عورت کے جسمانی تناسب اور اس کے حسن و دلفریبی کے جو بے مثل نمونے ہمیں نظر آتے ہیں ان کا ایک رُخ جمالیاتی اور دوسرا جنسی ہے۔ کسی عورت کی تصویر کے نرم و گداز خطوط یا اس کے مجسمے کی گولائیاں باوجود اپنی جمالیاتی خوبی کے جنسی خواہشات کی کارفرمائیوں سے بالکل علیحدہ نہیں کی جاسکتیں...... جوانی جب آتی ہے تو اکثر شعر اور موسیقیت کو ساتھ لاتی ہے، ان سب کو اُکسانے والی چیز جنس یا عورت ہے۔" (سید مجید اللہ)

عورت کے داخلی وجود سے مکالمہ کی راہ ہونٹ سے ہی روشن ہوتی ہے۔

۷

ہونٹوں میں جنت ہوتی ہے اور سلسبیل کی نہریں بھی۔ ہونٹ میں حیات، حرارت، حرکیت اور Healing Power ہے۔ ہونٹ چشمہ آبِ حیات ہے۔ اس کا جمال اور وصال زندگی کو تازگی، شگفتگی اور شفا عطا کرتا ہے۔ یہی Natural Connectivity کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

ہونٹ میں آب بھی ہے آتش بھی۔ جب جوان گدرائے ہوئے جامن ہونٹ، لال ہونٹوں پہ ثبت ہوتے ہیں تو حیات کی حرکیت نشاط انگیز ہو جاتی ہے اور بدن کی خنکی کو حرارت مل جاتی ہے۔ شیو جی، اوما کے سرخ ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے تھے تو اوما کے پورے جسم میں لذت کی لہر دوڑ جاتی تھی، اور بودلیئر کے خیال میں مردوں کے دانتوں کی خاطر ہی ملے ہیں عورتوں کو نوکیلے سرپستان۔

> ''آسٹر کے کنارے چلتے ہوئے میں نے بریگیٹے کو پہلی بار بوسہ دیا تھا۔ کہنے لگی، ''اسکاچ وہسکی کے بجائے اندرونی ٹھنڈ کو دور کرنے کا یہ زیادہ موثر طریقہ ہے۔ اُس رات بریگیٹے میرے کمرے میں بھی سوئی۔ اُس کے ہونٹوں میں شہد بھرا ہوا تھا۔ اس کی چھاتیاں ملائی کی طرح ملائم تھیں۔ میں نے پہلی بار اتنی خوبصورت عورت کو برہنہ دیکھا تھا۔''
>
> (جہنم کے نو ماہ — منیر الدین احمد)

ہونٹ کے گلقند سے ہی بیمار شفا پاتا ہے۔ کسی نازنین کے ہونٹ موتی سے زیادہ چمکدار، شکر سے زیادہ شیریں ہوتے ہیں۔ محبوب کے ہونٹوں کی شکر انگیز قند جان عطا کرتی ہے۔ سروگل اندام کے ہونٹ کے ایک جرعے سے خاکیانِ عشق کے لیے مٹی مشک

بار اور لعل گوں ہو جاتی ہے۔ ہونٹ ہی مرکز لطف، مدار حسن اور محور وصال ہے۔ یہ آبِ حیات کی نہر بھی ہے۔ اس کے سامنے عقیق یمنی بھی ہیچ ہے۔ لب لعل سے تو شراب بھی شرمندہ ہو جاتی ہے۔ ہونٹ میں مقناطیسیت ہوتی ہے اور اتنی قوت شفا کہ دانتوں کے جراثیم کو کچل ڈالتی ہے اور جسم کی میٹا بولزم کو بڑھاتی ہے۔ کلوریز کو ختم کرتی ہے۔ ہونٹوں کے ادغام سے انسان کا داخلی دفاعی نظام بھی مستحکم ہوتا ہے۔ جب عاشق اپنے ہونٹوں کے درمیان معشوق کے زیریں ہونٹ کو لیتا ہے تو اس کے پورے وجود میں ایک آتش سی دوڑنے لگتی ہے اور جب عورت اپنے زیریں ہونٹ میں مرد کے بالائی ہونٹ لیتی ہے تو نشاط کی پُر کیف منزلوں کو طے کر جاتی ہے اور کبھی کبھی سر کی جنبش اور حرکت کے ساتھ جو چمبن ہوتا ہے وہ پورے وجود کو لرزاں کر دیتا ہے۔ جنسی کیف و نشاط کی منزل ہونٹوں سے ہی طے ہوتی ہے۔ ہونٹوں کی شراب پینے سے ہی مدہوشی، سرشاری اور سکر کی منزل میسر ہوتی ہے۔ دو ہونٹوں کے تصادم سے ہی بدن میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔

ہونٹوں ہی میں مخفی ہے عید وصال اور جام بادۂ گل گوں سے مست جولب ہوتے ہیں اس میں تو نشاط کی ساری کیفیات ہوتی ہیں۔ یاقوت جاں فزاں لعل دلکش، وصل جاناں کی نوید ہیں اور ہونٹوں کی آمیزش، اتصال، ارتباط سے ہی بدن میں تہیج اور تحرک جنم لیتا ہے جو اپنی انتہا میں پہنچ کر پورے وجود کو جمال سے سرشار کر دیتا ہے۔

ہونٹ حبیب بھی ہے، طبیب بھی، یہی مفرح یاقوتی ہے۔ اس کی آتش میں آبِ حیات ہے اور اِس کے آب میں آتش نہاں ہے۔ ہونٹ کی آتش سے وجود شبنمی ہوتے ہیں اور اِس کے آب سے آتشیں ہو جاتے ہیں۔ لب گل اندام تو شباب آور ہے جو بوڑھے کو بھی جوان کر دیتے ہیں۔ گل نورستہ اور دلبر نوخاستہ کے ہونٹ تریاق کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ لاکھوں مرجان سے زیادہ قیمتی ہیں۔ شیریں ہونٹ سے شکر بھی شرمسار ہوتی ہے اور شراب بھی۔ گل رخوں کے ہونٹ شہد کا چشمہ ہوتے ہیں۔ ہونٹ سے جوانی بھی ملتی ہے اور حیات بھی۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں......

اگر زلعل لبِ یار بوسہ یابم
جواں شوم زسرو زندگی دوبارہ کنم

(اگر میں یار کے لعل جیسے ہونٹ کا ایک بوسہ پالوں۔ از سرنو جوان ہو جاؤں اور دوبارہ زندگی حاصل کرلوں۔)

معشوق کی نرگس مکحول سے عاشق بیمار ہو جاتا ہے۔ مگر لب جاناں کی ایک جرعہ فشانی سے اُسے نئی زندگی مل جاتی ہے۔ تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہونٹوں کے بوسے حیات عطا کرتے ہیں اور سرخ ہونٹ تو زہد شکن ہوتے ہیں۔ اِس سے تو مینکا کی طرح زاہدوں کی تپسیا بھی بھنگ ہو جاتی ہے۔ بقول حافظ......

ہر زاہدے کہ دیدہ یاقوت مے فروشت
سجادہ ترک دادہ پیمانہ در کشیں

(جس زاہد نے تیرے شراب فروش سرخ ہونٹ کو دیکھ لیا اُس نے مصلی کو چھوڑا، شراب پینے لگا۔)

پھول سے زیادہ حسیں، نسریں سے زیادہ تازہ، گل سوری اور نسریں کی طرح خوشبودار از سرتاپا جان عاشقاں کے ہونٹ ہی میں زندگی ہے۔ اسی لیے تو شیریں کے ہونٹوں کی حسرت میں فرہاد کی قبر سے اب تک لالہ اُگتا ہے۔

دنیا کے تخلیقی جمالیاتی ادب میں لب یار کی جمالیات کو پوری نشاطی کیفیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہونٹ میں جو مقناطیسی جمال ہے، اُسے دنیا کے سارے عاشقوں، حسن پرستوں نے محسوس کیا ہے۔ دنیا کے بہترین شہ پاروں میں لب کی جمالیات کا جو نگار خانہ آباد ہے، اُس کی سیاحت سے اندازہ ہوتا ہے کہ معشوقوں کے ہونٹ میں ہی جنت ہے۔ اُس کی سرخی جان لیوا اور قیامت خیز ہوتی ہے کہ شبستاں میں جب ہونٹوں کے انگارے دہکتے ہیں تو در و دیوار بھی آتشیں ہو جاتے ہیں۔ جولیا رابرٹ، پین لوپ کروز، انجلینا جولی، ناؤمی کیمبیل، مارلن منرو، جنیفر لوپز، کیتھرین زینا جونز اور کیلی مینوگ کے شہوانی ہونٹ میں حیات بھی ہے، ممات بھی۔ انہیں ہونٹوں کی آتش سے

سرد رات روشن ہوتی ہے اور جلتی سلگتی رات شبنمی ہوجاتی ہے۔ ساون اور کاتک کی سرد خنک رات میں ہونٹ جیٹھ کی طرح سلگتے ہیں اور یہ ہونٹ ہی ہیں جو پہاڑ، سمندر، بیاباں، دشت، گھنے جنگل کے فاصلوں کو ختم کر کے وحدت میں ضم کر دیتے ہیں۔ انسانی وجود میں بسے ہوئے پہاڑ بیابان ایک ہونٹ کے لمس سے روئی کے گالے کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ بھادوں کی تاریک رات میں ہونٹ ہی روشن رہتے ہیں اور ساون میں یہی ہونٹ برستے ہیں تو پورے جسم میں ایک سنسنی سی پھیلا دیتے ہیں۔ ہونٹ کاتک اگہن کی سرد رات میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں اور جیٹھ میں شبنم کی طرح ہوجاتے ہیں۔ ہونٹ ہی سے خزاں رسیدہ موسم سرسبز ہوجاتے ہیں اور ہونٹوں سے ہی بدن میں بسنت اُگتی ہے۔

ہونٹوں کی اسی جمالیات کو دنیا کے شاعروں، ادیبوں اور تخلیق کاروں نے مختلف جمالیاتی زاویوں سے دیکھا ہے اور لب شیریں کی حلاوت، نازکی کو اپنے اپنے تخیل کے جمال خانے میں بہت ہی خوبصورتی سے سجایا ہے۔ مثنوی خواب وخیال میں یہی ہونٹ کچھ اس طرح سے اپنا رنگِ جمال دکھاتے ہیں......

لب نازک ہیں رشک برگ گل　　نشہ پرداز تر ز ساغر مل
جام ہے آپ ہی اور آپ ہی گزک　　ہونٹ کیا ساری نعمتوں کی چسک
لب شیریں میں جو حلاوت ہے　　جان شیریں میں کب وہ لذت ہے

یہ ہونٹ ہی تمہید وصال ہے۔ اسی سے ایک عاشق حریم خلوت میں داخل ہوتا ہے۔ قلی قطب شاہ نے ہونٹوں سے ہی وہ ساری منزلیں طے کی تھیں جو نشاط آفریں اور آنند کی انتہا کہلاتی ہیں۔ ہونٹ دراصل پورے اعصابی نظام میں ایک ایسے کیمیائی عناصر کو جنم دیتے ہیں کہ انسان ثنویت کو بھول کر وحدت میں ضم ہوجاتا ہے۔ ہونٹ کے جمال سے ہی وصال کی منزلیں طے ہوتی ہیں اور یہی اجنبیت کو آشنائی میں تبدیل کرتے ہیں اور پھر اُس مقام تک پہنچا دیتے ہیں جس کا منتہا لذت بے کراں ہے......

''کملا اس کے سامنے بالکل برہنہ کھڑی تھی۔ ساگر اس کے جسم کے ابھرے ہوئے نقوش کو دیکھ رہا تھا۔ سانولی رنگت کے ان ابھاروں پر سرخی مائل دو

کونپلیں نکل آئی تھیں جو ساگر کو حیران کئے دے رہی تھیں۔ وہ بھونچکا سا کملا کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کملا بستر پر لیٹ گئی اور ساگر کو بھی اپنے ساتھ لٹا لیا اور اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ وہ اس کے گالوں کے بوسے لے رہی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں میں لے جا کر چاٹ رہی تھی۔ اس نے ساگر کے ہاتھ اپنی گول مٹول چھاتیوں پر رکھ دیے۔ دھیرے دھیرے اس نے ساگر کے کپڑے بھی تار تار کر دیے۔ ساگر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پکچروں میں اس نے ایسا کوئی سین کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر کملا ایسا کیوں کر رہی ہے۔ کملا اس کے بدن کو ایسے چاٹ رہی تھی جیسے گائے اپنے بچھڑے کو چاٹتی ہے۔" (نئی ٹیچر — نریندر سیٹھ)

"ساگر نے آگے بڑھ کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پیوست کر دیے تو وہ گھبرا گئی اور ساگر کی بانہوں سے نکلنے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔ ساگر دیوانہ وار اس کے ہونٹوں کو کاٹ رہا تھا۔ اس کی صراحی دار گردن اور سینے کو اپنے لعاب سے تر کر رہا تھا۔ مینا اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ لیکن ساگر کی پکڑ اور مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

(نئی ٹیچر — نریندر سیٹھ)

"کئی بار اس نے سوچا کہ سریندر کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔ بوسوں سے اس کے تصور میں، اس کے تخیل میں، اس کی کلپنا میں رنگ گھول دے تاکہ اس کی تخلیق میں زندگی بھر جائے...... وہ یہ بھی سوچتی کہ سریندر اپنی تخلیق مکمل کرنے کے بعد اس کو خود اپنی بانہوں میں لے لے گا۔ اس کے اخروٹ جیسے رنگ کے جسم کو اپنے بوسوں کے رنگوں سے بھر دے گا۔ اُس کی سانولی صورت کا سارا نمک چاٹ لے گا اور اُس کی روح کو ہر طرح کی تسکین پہنچائے گا۔

... سریندر جب واپس اسٹوڈیو پہنچا تو اس کی نظروں کے سامنے سمیتا کی

شکل تھی۔ اس کا وہ سانولا مگر کھلا ہوا چہرہ، اس کی چمکدار آنکھیں، صراحی دار گردن، بے حد مناسب سینہ اور اس پر پھوٹتی جوانی کے دلآویز اُبھار، پتلی کمر، چوڑے کولہے، گول مٹول ٹانگیں۔ اس کے ذہن میں گزرے زمانے میں کسی بت تراش کی بنائی ہوئی دیوی کی کانسے کی مورتی تھی جو اب اینٹک ہونے کے ناطے کچھ کچھ کالی پڑ گئی تھی لیکن اس کی چمک اسی طرح برقرار تھی۔

......سمیتا نے جیسے ہی پینٹنگ کو دیکھا، خوشی سے جھوم اٹھی۔ اس نے سریندر کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں اور پنجوں کے بل کھڑی ہو کر اپنے ہونٹ سریندر کے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیے۔''   (نئی ٹیچر —نریندر سیٹھ)

ہونٹ میں صرف شیرینی نہیں بلکہ گیان بھی ہے جو انسان کو نروان کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ سرخ ہونٹوں میں گیان کے جو دیے جلتے ہیں، وہی دیے انسان کو وجدانی معرفت عطا کرتے ہیں۔ ہونٹ کی وحدت سے ہی زندگی کے اندر تازگی، شادابی، پیدا ہوتی ہے اور اجنبیت کا تصور معدوم ہوتا ہے۔ یہ ہونٹ ہی انسانی کائنات کی معرفت کا سب سے مؤثر وسیلہ ہے اور اسی سے طبعیاتی، مابعدالطبعیاتی، روحانی ماورائے روحانی، انفس و آفاق کے منازل منکشف ہوتے ہیں۔ انفس و آفاق کی معرفت اور عالم جبروت، ملکوت اور لاہوت کی سیاحت بھی ہونٹوں سے ہی طے ہوتی ہے......

''سمجھ گیا۔'' سدھارتھ نے تپاک سے کہا۔ ''تمہارے منہ سے نکلے الفاظ کو سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ تمہارے ہونٹ ایسے لگتے ہیں، کملا، جیسے تازہ کٹے ہوئے سرخ انجیر۔ میرے ہونٹ بھی ایسے ہی ہیں۔ سرخی مائل اور کنوارے۔ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ یہ صرف تمہارے ہی ہونٹوں کے لیے بنے ہیں؟ لیکن کیا تمہیں مجھ جیسے ایک شرون سے خوف لگتا ہے جو محبت کی تعلیم حاصل کرنے جنگل سے تمہارے پاس آیا ہے؟''

''کیسا خوف؟ ایک ناسمجھ شرون سے میں کیوں ڈروں گی جو جنگل سے،

سیاروں کی بستی سے آیا ہے اور عورتوں کے معاملے میں بالکل اناڑی ہے۔''
''یہ شرون بہت طاقتور ہے حسینہ۔ اس کو کسی کا خوف نہیں۔ وہ تم سے جو چاہے کروا سکتا ہے، تمہیں لوٹ سکتا ہے، نقصان پہنچا سکتا ہے۔''
''میں نہیں ڈرتی شرون۔ کیا کسی شرون یا برہمن کو کبھی ایسا خوف ہوا ہے کہ اس پر دھاوا بول کر اس کا علم، اس کی پاکیزگی اور گہرائی تک غور و خوض کرنے کی صلاحیت چھین لے گا، نہیں۔ اس لیے کہ وہ اس کی اپنی چیز، اپنی دولت ہے۔ ان میں سے وہی چیز کسی کو مل سکتی ہے جسے وہ خود دینا چاہے اور وہ بھی اسے ہی جسے وہ خود منتخب کرے۔ کملا کے بارے میں اور محبت کی لذتوں کے بارے میں بھی یہی سچ ہے۔ کملا کے ہونٹ خوبصورت اور سرخ ضرور ہیں لیکن ذرا کملا کی خواہش کے خلاف ان کا بوسہ لو۔ تمہیں ذرہ برابر شیرینی نہیں ملے گی۔ حالانکہ شیرینی دینا کملا کے ہونٹوں کو آتا ہے۔ تم اگر باصلاحیت شاگرد ہو سدھارتھ، تو یہ بھی سیکھ لو کہ آدمی مانگ کر یا مول لے کر محبت پا سکتا ہے۔ دے بھی سکتا ہے۔ یا بازار سے خرید بھی سکتا ہے لیکن وہ چرائی نہیں جا سکتی۔ تم غلط سمجھے سدھارتھ۔ تم جیسا ہوشیار نوجوان سمجھنے میں بھول کرے یہ افسوس کی بات ہے۔''
سدھارتھ سر جھکا کر مسکرایا۔ ''ٹھیک کہتی ہو کملا۔ سچ مچ افسوس کی بات ہے۔ تمہارے ہونٹوں کی مٹھاس کا ایک ذرّہ بھی رائیگاں نہ ہونا چاہیے۔ میرے ہونٹوں کا بھی نہیں۔ سدھارتھ پھر آئے گا جب اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ جب کپڑے، جوتے اور روپے ہوں گے وہ پھر آئے گا۔ لیکن کیا تم مجھے ایک مشورہ دے سکتی ہو۔''
''مشورہ؟ ضرور۔ سیاروں کی بستی سے آئے غریب، اجنبی شرون کو کون مشورہ دینا نہیں چاہے گا۔''
''تو یہ تینوں چیزیں مجھے کہاں سے حاصل ہو سکتی ہیں؟''

''یہ کئی لوگ جاننا چاہتے ہیں دوست۔ تمہیں جو بھی کام آتا ہو، وہی کرو۔ اس کے بدلے میں دولت، کپڑے اور جوتے لے لو۔ غریب کے پاس اس کے علاوہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ تم کیا کر سکتے ہو؟''

''میں سوچ سکتا ہوں، میں انتظار کر سکتا ہوں، میں بھوکا رہ سکتا ہوں۔''

''بس......؟''

''ہاں ایک کام اور۔ میں شاعری کر سکتا ہوں۔''

''کچھ سناؤ۔''

''کیا تم ایک نظم کے لیے ایک بوسہ دے سکو گی؟''

''نظم اچھی ہوئی تو یہ ہو بھی سکتا ہے۔''

ایک لمحہ کی فکر کے بعد سدھارتھ نے نظم سنائی......

ایک حسین دوشیزہ/ آئی گشت گلشن کو/ گلستاں کے دروازے/ پر کھڑا تھا اک شرون/ جس نے اک نظر دیکھا/ اور اس کی خدمت میں/ ہاتھ جوڑ کر اپنے/ احترام دے ڈالا/ وہ حسین دوشیزہ/ مسکرائی زیر لب/ جنگلوں کا شہزادہ/ سوچنے لگا کچھ یوں/ کیوں نہ دیوتا اس کی/ بارگاہ میں آئیں/ باادب، خمیدہ سر۔

کملا نے اتنی زور سے تالی بجائے کہ اس کی کلائیوں کی طلائی چوڑیاں کھنکھنا اُٹھیں۔

''تمہاری نظم بہت خوبصورت ہے شرون۔ میں سمجھتی ہوں اس کے بدلے میں ایک بوسہ دے دینا گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔''

اس نے نگاہوں کے اشارے سے سدھارتھ کو نزدیک بلایا۔ سدھارتھ اپنے چہرے کو اس کے چہرے کے بالکل قریب لے گیا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹ مس کیے جو تازہ کٹے انجیر کی طرح تھے۔ کملا نے پورے جوش کے ساتھ اس کا بوسہ لیا۔ جذبات کی رو میں سدھارتھ کو یوں

لگا کہ کملا نے اسے نہ جانے کتنا کچھ سکھا دیا ہے۔ اس نے سوچا یہ کتنی ہنر مند ہے۔ کس طرح اس نے مجھے مسحور کر دیا۔ اس طویل بوسے کے بعد کتنے ہی اور بوسے اس کے منتظر تھے۔''

(سدھارتھ ـــ ہرمن ہیس، ترجمہ: یعقوب یاور)

ہونٹ میں شراب سے زیادہ سکر اور مدہوشی کی کیفیت ہوتی ہے۔ ہونٹ سے ہی انسان سرشاری کی ان منزلوں تک پہنچتا ہے جہاں وہ سب کچھ بھول کر ایک جسم میں مدغم ہو جاتا ہے اور اُس وقت جسم ایک خوبصورت حسین کائنات میں بدل جاتا ہے۔ جسم کی اِس کائنات کی سیر کا قفل ہونٹ ہی ہیں......

''کمرے میں موسیقی کی آواز گونج رہی تھی۔ شاید ''اسپائس گرل'' کا کوئی گیت تھا۔ گیت کی دھن اور موسیقی کے مد و جزر پر کرن کا چھریرا بدن یوں تھرک رہا تھا، لچک رہا تھا اور لہرا رہا تھا گویا وہ نشے میں ہو اور سچ مچ وہ نشے میں تھی مگر بیئر یا الکوحل کے نشے میں نہیں بلکہ نشہ تھا خوشی کا، جوش کا اور سرمستی کا جس نے اسے نیم مدہوش سا کر دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر وفورِ جذبات نے ایک تمتماہٹ سی پیدا کر دی تھی۔ اس کے سانولے بازو فضا میں بلند تھے اور اس کی سڈول ٹانگیں جو نصف رانوں تک عریاں تھیں۔ گیت کے ردھم پر ہولے ہولے تھرک رہی تھیں۔ اس کے چہرے کے نقش و نگار گو زیادہ خوب صورت نہیں تھے۔ بس جوانی کے رنگ نے انہیں جاذبِ نظر بنا دیا تھا مگر اس کا ابھار، کولہوں کے دائرے اور پنڈلیوں کی گولائیاں سر سے پاؤں تک پورے بدن کا ہر نشیب و فراز اتنا متناسب اور موزوں تھا کہ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اگر کہیں ذرا سی بھی کمی بیشی ہو تو اس کا بدن اپنی تمام حشر ساماں دلکشی اور پرفسوں جاذبیت کھو بیٹھے گا۔''

''وہ دونوں تو اس طرح ایک دوسرے میں سمائے ہوئے تھے جیسے ایک جان

اور ایک جسم ہوں۔ نکی کے لمبے بال شانوں اور پوری پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر ایک باریک سلکی فراک تھا جو بمشکل نصف ٹانگوں تک پہنچ رہا تھا۔ فراک کا گلا بھی اتنا کشادہ تھا کہ اس کے سینے کی پوری طرح ستر پوشی کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی لمبی خوبصورت بانہیں ڈینی کے گلے میں حائل تھیں اور وہ پوری طرح ڈوب کر، مدہوش ہوکر اس کے ہونٹوں کو چوم رہی تھی۔ ڈینی کا ایک ہاتھ اس کی کمر میں تھا جب کہ دوسرا ہاتھ اس کے جسم کے دلکش نشیب و فراز کی پیائش کررہا تھا۔ پہلے اس کے ہاتھ نے گولائیوں کو سر کیا۔ پھر کمر کی گہرائیوں میں اترا۔ پھر اوپر سرکا، لیکن جونہی سینے سے چھوا، نکی نے جھٹکے سے ہونٹ الگ کیئے۔ اس کے ہاتھ پر ہلکی سی چپت ماری اور شوخی سے بولی۔

''ڈونٹ بی سلی...''

''اوہ کم آن نکی...''

''نو، یو اسٹوپڈ...'' (لاکھوں میں ایک --- ش صغیر ادیب)

''ڈاکٹر ریڈی نے معائنہ کرتے وقت اس کے شہوت بھرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ اس پہلے بوسے نے شیاملی کو تڑپا کے رکھ دیا۔ وہ بار بار دانت درد کا بہانہ کر کے ڈاکٹر ریڈی کے کلینک پہنچ جاتی۔ (چڑی کی بیگم...... دیپک بدکی)

ملا وجہی نے قطب مشتری میں قلی قطب شاہ کی لب پوشگی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس عمل نے انہیں اس قدر مدہوش کردیا تھا کہ وہ سب کچھ بھول کر ہونٹوں میں گم ہوگئے تھے اور حواس کی شدت اُن پر غالب آگئی تھی کہ انہوں نے چولی کے سارے بند ہی توڑ دیے تھے......

گھونگھٹ کھول بوسے لیے ذوق سوں
سو چولی کے بند توڑ سب شوق سوں

(قطب مشتری)

میر تقی میرؔ نے لب کی جمالیات کو تمام تخلیق کاروں سے مختلف انداز میں منعکس کیا ہے۔ انہوں نے لب کی نازکی، شوخی، تازگی، شادابی کو اپنے زاویے سے محسوس کیا ہے۔ لب کی جمالیات کے تمام تر زاویے ان کی شاعری میں بہت خوبصورتی کے ساتھ منور ہو گئے ہیں۔ میرؔ کو گل اندام صنم کے ہونٹوں میں جو خوبصورتی اور جمال نظر آتا تھا، وہ انہیں مدہوشی کی منزل تک پہنچا دیتا تھا اور اُن کے باطن میں حسرتوں اور محرومیوں کی ایک دنیا بسا دیتا تھا۔ لب یار کی جمالیات پہ اُن کے یہ شعر اُن کے درد پنہانی کی عیانی ہیں......

دونوں لب اس کے لعل بدخشاں
دست حنائی پنجہ مرجاں

برگ گل سے زباں ہے نازک تر
پھول جھڑتے ہیں بات بات اوپر

تم نہ گل برگ و لعل ناب کہو
بات جب تک نہ ٹھہرے چپکے رہو

کوئی جاں بخش یوں کہے سو کہے
ہم تو مرتے ہی ان لبوں پہ رہے

کنج لب آرزوے جان و دل
آگے چلنا نگاہ کو مشکل

ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے
قند و مصری کو کیوں نہ نام رکھے

ایسی ہوتی نہیں ہے سرخ لبی
رنگ گویا ٹپک پڑے گا ابھی

گل برگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹ لعل ناب سا

یعقوب کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے
گل برگ ہی کچھ تنہا پائی نہیں خلعت سے
جنبش سے ترے لب کی یاقوت بھی تر آیا
چپکے دیکھو جھمکتے دے لب سرخ
ذکر یاں کیا ہے لعل و مرجاں کا

جب میسر ہو بوسہ اس لب کا
چپکے ہی ہو رہو نہ بولو تم

(میر تقی میر)

میر تقی میر کے علاوہ مصحفی نے بھی لب لعل میگوں کی جمالیات کو اپنے تخلیقی تخیل سے ایک نئی معراج عطا کی ہے......

طرح و زیر آب صحبت وصل
یوں میسر ہو ان کو خلوت وصل
یہ حمائل کرے (دو) دست اس کی
چومی وہ لعل می پرست اس کی
لب سے لب کامیاب ہو تہہ آب
دوستی کا حساب ہو تہہ آب

(مصحفی)

مصحفی نے اس میں ایک نیا زاویہ پیدا کیا ہے کہ تہہِ آب بھی ہونٹ سے ہونٹ کی پیوستگی تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی انسان کو حیات بخش دیتی ہے۔ دراصل ہونٹ اتصال، انضمام، ادغام، اشتراک کی سب سے بڑی علامت ہے۔ ایک ہونٹ کی دوسرے ہونٹ میں پیوستگی سے بدن میں گلستاں کھل جاتے ہیں۔ جسم میں چمن اُگ

آتے ہیں۔ بوس و کنار سے شب کی تاریکی، دن کے اجالے میں بدل جاتی ہے۔ خنکی حرارت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اِس لیے ہونٹوں کی حسرت ہرایک دل میں پیدا ہوتی ہے اور جنہیں معشوق کے ہونٹ میسر ہوتے ہیں، وہ دنیا کے خوبصورت اور خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں۔ اُردو کے شاعروں نے بھی ہونٹ کی حسرتوں میں گم اپنی آتش نہانی کا ذکر کیا ہے اور ہونٹ جیسے مرکز وصال کی آرزو میں اپنی عمریں رائیگاں کردی ہیں۔ جرأت، ذوق، انشاء، احسن، تسلی، حکیم، سوز، شگفتہ، صادق، فیض علی فیض، قیس، قدرت، قسمت، مقصود، ممنون، ولا، ہادی، ہدایت سبھی کے دل میں ایک بوسے کی حسرت بسی رہی ہے۔ وہ اپنی حسرتوں کا اظہار مختلف انداز سے کرتے رہے اور ہونٹ کے حریم خلوت میں داخل ہونے کے لیے کوشاں رہے۔ دراصل یہ بے چینی، یہ اضطراب ہونٹ کے اُس مقناطیسی جمال کے حصول کی کوشش ہے جس کے اندر پورے جسم کو جنبش دینے کی طاقت ہے اور حیات دینے کی شکتی۔ اسی لیے شاعر اور تخلیق کار خیال میں بھی بوسوں کے اژدہام سے خوش ہوجاتے ہیں۔ یہاں سارا معاملہ خیال میں وصال کا ہے اور خواب میں بھی شاعروں کو ہونٹ کا ہی خیال رہتا ہے کہ یہی مرکز ومحور جمال اور حریم وصال ہے......

اُمیدوار بوسہ لب ہے کھڑا کوئی
دیتا ہے تجھ کو دیر سے پیارے دعا کوئی

(قسمت)

دو قطبی توانائیوں (Polar Energies) میں ہم آہنگی کا ذریعہ ہونٹ ہی ہے، اور تخلیق وتنقید بھی ادب کی دو Polar Energies ہیں۔

۸

''ادبی متن، جسم ہے۔''

یہ بات بارتھ نے کہی ہے۔ فرانس کے مشہور پس ساختیاتی مفکر بارتھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ ادیب، متن اور قاری کا رشتہ اپنی نشاط کے اعتبار سے شہوانی نوعیت رکھتا ہے۔

بارتھ کے اس قول کی روشنی میں اگر عالمی ادبیات کے کسی بھی اعلیٰ متن کو پرکھا جائے تو متن بھی ایک بھرپور بدن کی طرح نظر آتا ہے اور اس کے اندر وہی اسرار ہوتے ہیں جو بدن کے ہیں اور جو بدن کے جمالیاتی عناصر ہیں وہی متن میں بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ داستان ہو یا افسانہ، مثنوی ہو یا ماہیا یا کوئی اور صنفِ سخن۔ ہر ایک متن بدن ہوتا ہے۔ اردو افسانے کے کسی بڑے متن کی تہہ در تہہ قرأت کیجئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی سندر کومل بدن کی گہرائیوں میں اتر رہے ہوں اور حظ و انبساط کے مقامات سے گزر رہے ہوں۔ لذت بدن کی طرح لذت متن سے سرشار ہو رہے ہوں... ہر اعلیٰ متن میں نازنیناں مہر و جمال، ماہ تمثال کے کچوں کے ابھار، مہ وشان گل اندام کے ساعد سیمیں دست پر نگار، گل رخاں سیمیں بدن کے مو کمر سے بندھے کوہِ برف جیسے سرین پر وقار، گل پیرہن سیب ذقن کے عنبریں گیسو، زلفِ سیہ مار، فتنہ روزگار کے شعلہ رخسار کا بیان ملتا ہے۔

فکشن میں منٹو کا متن بہت اعلیٰ ہے اور یہ متن بدن کی طرح لذت بخش اور نشاط انگیز ہے۔ منٹو کے اس متن میں کس قدر جمالیاتی نشاط ہے......

- سوگندھی کو بھی اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا۔ نیچے سے ان سیب کے گولوں کو باقاعدہ باندھ کر رکھا کر۔ انگیا پہنا

کرے گی تو ان کی سختائی ٹھیک رہے گی۔ (ہتک)

- دیر تک وہ گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گانٹھ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بھیگنے کی وجہ سے بہت مضبوط ہوگئی تھی، جب تھک ہار کر بیٹھ گئی تو اس نے مراٹھی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا— ''میں کیا کروں نہیں نکلتی۔'' رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گانٹھ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا۔ دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور زور سے کھینچا، گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے دونوں ہاتھ اِدھر اُدھر ہٹے اور دھڑکتی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ رندھیر نے ایک لمحہ کے لیے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نئی نئی گندھی ہوئی مٹی کو چابکدست کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔ اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔ مٹمیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں، ایک عجیب قسم کی چمک محلول تھی، سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کردی تھی جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار دیے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔'' (بو)

منٹو کائنات کے اسرار و رموز کا عارف ہے اور Biology of Beauty پر ان کی نگاہ اتنی گہری ہے کہ جمالیات کی روح تک رسائی حاصل کی ہے اور کائنات کی سب سے خوبصورت شئے کا اکتشاف کیا ہے۔ عورت کے جسم میں جو Symmetry ہے اور جسمانی کشش کا جو معیار ہے، منٹو اس سے آگاہ تھے۔ حسن اور زرخیزی کی علامت کا اکتشاف ایک بہت بڑی دریافت ہے۔ ان کی نظر میں کائنات کی حقیقت کا ادراک یا انکشاف گناہ نہیں۔ منٹو نے عورت کے جسم میں اس تخلیقیت کے منبع کو تلاش کیا ہے جس پر کائنات اور نسل انسانی کا دارومدار ہے۔ چھاتیاں، حسن اور زرخیزی کی ہی علامت نہیں

بلکہ تخلیقیت کا سرچشمہ بھی ہیں۔ شکیل الرحمٰن نے منٹو کی جمالیات شناس نگاہوں کی نکتہ رسی کو بیان کیا ہے اور چھاتیوں کی Natural Gravity اور Vitality کو اُجاگر کیا ہے۔ یہی چھاتیاں یعنی Breast Curves زرخیزی (Fertility) کا اشاریہ ہیں اور انبساط و آنند کا سرچشمہ بھی۔ شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں......

''جب عورت کا وجود ایک کائنات کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے تو پستان، چھاتیاں بڑی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ مرد کے بعد عورت کی تخلیق ہوئی اور پھر پستان خلق ہوئے۔ پستان قدرت کی آخری تخلیق ہیں...... آخری خوبصورت تخلیق...... ان کے بعد کوئی تخلیق نہیں ہوئی۔ قدرت کی تخلیق کا کام ہی جیسے ختم ہو گیا، عورت کے پستانوں کے حسن نے تو حسن کی صورتوں کی تشکیل کے امکانات ہی ختم کر دیے۔ ان کے بعد بھلا کون سی خوبصورت شئے وجود میں آئی ہے؟''

سعادت حسن منٹو چھاتیوں کی اہمیت جانتے ہیں، خصوصاً ان کے جمال سے واقف ہیں۔ انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں چھاتیوں کے حسن اور اس کے جلوے کو حد درجہ محسوس بنا دیا ہے۔ مثلاً......

- ''اس کا سینہ جیسے گہری نیند سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' (شانتی)
- میرے سینے کی گولائیوں مین مسجدوں کے محرابوں جیسی تقدیس کیوں آ رہی ہے؟'' (سڑک کے کنارے)
- ''میرے سینے کی گولائیاں پیالی پیالی بن رہی ہیں۔'' (سڑک کے کنارے)
- ''اس کی جیتی جاگتی چھاتیاں آبنوسی گولوں کی صورت میں اس کے سفید نینوں کے دو پٹوں کے پیچھے بڑا دلکش تضاد پیدا کر رہی تھیں۔'' (کتاب کا خلاصہ)
- ''بڑی نرل قسم کی چھاتیاں دھڑک رہی تھیں۔'' (کتاب کا خلاصہ)
- ''اس کا سینہ سانسوں کے اُتار چڑھاؤ سے ہل رہا تھا۔'' (سو کنڈل پاور بلب)
- ''اس کے اُبھرے سینے کو مسلنے لگا۔''

''اُبھرے ہوئے سینے کو جھنجھوڑا۔''

''چوس چوس کر اس کا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔'' (ٹھنڈا گوشت)

- ''وہ خوبصورت نہیں تھی، لیکن اس میں وہ تمام قوسین اور وہ تمام خطوط موجود تھے جو ایک جوان لڑکی میں موجود ہتے ہیں۔'' (وہ لڑکی)
- ''اس کی چھاتیاں کافی اُبھری ہوئی تھیں۔'' (ہتک)
- ''سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔'' (ہتک)
- ''گیلے سینے پر پانی کے قطرے پھسل رہے تھے۔'' (دو قومیں)
- ''چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔'' (موذیل)
- ''اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ اُبھار دیے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔'' (بو)

یہ جمالیاتی انکشافات ہیں۔ چھاتیوں سے ہی جسم کا آہنگ سنائی دیتا ہے اور خوشبو بھی ملتی ہے۔

شاعری میں میر تقی میر کا متن بھی جمالیاتی انبساط سے معمور ہے......

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

گل تازہ شرمندہ اس رو سے ہو
خجل مشک ناب اس کے گیسو سے ہو

کیا صورت ہے، کیا قامت ہے دست و پا کیا نازک ہیں
ایسے پتلے منہ دیکھو جو کوئی کلال بناوے گا

اس لطف سے نہ غنچۂ نرگس کھلا کبھو
کھلنا تو دیکھ اس مژہ نیم باز کا

بدن میں اس کے تھی ہر جائے دلکش
بجا بے جا ہوا ہے جابجا دل

شب نہاتا تھا وہ رشک قمر پانی میں
گتھی مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں

شاعری میں غالبؔ کا متن بھی جمالیات سے معمور ہے۔ غالبؔ کے متن میں جو بدن ہے، وہ شعلۂ طور ہے، خدا کا نور ہے۔ انہوں نے پُر بہار لب، نازک کمر، قیامت قامتاں، مژگاں درازاں کا جو جمالیاتی نقشہ کھینچا ہے، وہ بے نظیر ہے اور بدن کا ایسا مقناطیسی بیان ہے کہ پانی بھی ایسے جسم سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ غالبؔ کے سومنات خیال میں مندر کے سندر مجسموں کی طرح خوبصورت بدن جگمگاتے ہیں۔ غالبؔ کے تخلیقی جمالیاتی اظہار کا ایک رنگ یہ بھی ہے......

دیکھ اس کے ساعد سیمیں و دست پر نگار
شاخ گل جلتی تھی مثل شمع، گل پروانہ تھا

اسد بہار تماشائے گلستان بہار
وصال لائلہ عذاران سرو قامت ہے

انشاؔء کا شعر ہے......

مزا جو آپ کے سینے کے کچھ اُبھار میں ہے
یہ سیب میں نہ بہی میں نہ وہ انار میں ہے

امراؤ جان ادؔا بھی ناول کا ایک بڑا متن ہے۔ یہ متن بھی بدن کی طرح لذت سے بھرپور ہے۔ اس میں امراؤ جان ادا کا خوبصورت حساس مگر ناآسودہ بدن ہی قاری کے ذہن کو آسودگی بخشتا ہے۔ ایک آئیڈیل بدن کی تلاش ہی اس عظیم جمالیاتی ناول کی دلچسپی کا باعث ہے۔ داستان کا ایک بڑا متن ''طلسم ہوش ربا'' ہے، اور یہ متن بھی بہت گدرایا، گٹھیلا اور کسیلا ہے۔ اس میں غالب حصہ بدن کے جمالیاتی عناصر کا ہے اور اسی

جمالیاتی عنصر کی وجہ سے اس داستان میں تحیر بھی ہے، تجسس بھی اور تلذذ بھی......

''رخِ روشن اس کا روئے آفتاب محشر تھا۔ چہرے میں نمک حسن و ادا بھرا، گرمی میں خاطر مشتاقاں کے لیے سوز و ساز دینے والا، زلف شکن در شکن کے حلقے نافہائے آہوئے چیں کا دل خون کرتے، آب و تاب سے ہر ایک عاشق کو دیوانہ بنا کر نیا جنون کرتے، زیر گیسوئے معنبر پیشانی انور، ابر تیرہ میں جیسے آفتاب سحر کا نور ظاہر، طبیعت خود بینوں سے بھری، ستواں ناک مابین رخسار یا دیوار چمن حسن رنگیں بنی۔ چشم سرمہ آگیں، جادو تمکیں، رُخ پر غازۂ صباحت حقیقت میں کان ملاحت، لب گل رنگ پر مرجان صدقے، شرم سے لعل بدخشانی ہیرا کھائے، دانتوں کے روبرو بے آبرو موتی ہو جائے۔ آواز اس کی شیریں، انداز نظر پر تمکیں، باتیں سب بھولی بھولی، دہن تنگ دیکھ کر خضر کو راہ بھولی، سینہ صاف پر چھاتیوں کی کچیں نمودار، کم سنی اظہار۔ شکم رشک موج قلزم، نور کمر چشم تصور سے بہت دور۔''

اسی طرح انگریزی میں لارنس کا متن ہو یا سنسکرت میں دنڈی کا متن، ہر ایک میں بدن کا جمال موجزن ہے۔ کیا کوئی بھی دنڈی کے ارفع متن کو مسترد کر سکتا ہے جس میں اس نے شہزادی کے ایستادہ پستان اور رتھ کے پہیے کی طرح وسیع سرین کا بیان کیا ہے۔

لوک گیت کا جو علاقائی متن ہے۔ اس میں بھی سارے جمالیاتی عناصر متحرک اور کارفرما ہیں۔ یہ علاقائی متن ہے مگر اوریجنل ہے......

پکی جھمریا رس بھری امرس چوئی چوئی اکارتھ جائے
چکھوے ہوئی بور سے بالم چاکھ لیو، ناہیں چاکھیں نگر کو بار

(لیموں جیسے جوبن کا رس چو چو کر اکارت جا رہا ہے۔ او میرے بدھو بلما، چکھنا ہے تو چکھ لو ورنہ نگر کا یار چکھ لے گا۔)

گوریا کے چھتیا پر اٹھارے جوبنوا، ہنسیں شہر کے لوگ
کئی لے گوری دموا، دئی دے جوبنوا، تو سے جتن نا ہوئی

(گوری کی ابھری ہوئی چھاتیاں دیکھ کر شہر والے ہنستے ہیں۔ اے گوری! میری ایک بات مان لے جوبن دے دے، دام لے لے، تجھ سے یہ سنبھالا نہ جائے گا۔)

گوری کے جوبنا اکسن لاگے، جیسے گول انار
مورکھ جانے کچھ روگ بھیو ہے، پیس لگاوے چھار

(گول گول اناروں کی طرح گوری کا جوبن ابھر رہا ہے۔ بیوقوف لوگ اسے بیماری سمجھ کر چھال پیس کر لگانے کی تجویز پیش کر رہے ہیں۔)

امبواک لاگے ٹکوروا رے ساتھی، گولر پھری ہے ہڑ پھوڑ
گوریاک اک ہے جوبنوا پیا کے کھلونا رے بنوا

(آم میں کیریاں اور تنا پھوڑ کر گولر کے پھل نکل آئے ہیں۔ میرے یار اور حسینے کا جوبن بھی ابھر آیا ہے جو ساجن کا کھلونا بنے گا۔)

نارنگی سی چھاتی اس کی چلنے میں کرتیں ابھرن
نر کی کیا بساط دیکھ دیودیوں کے دل میں ہوتی جرن
نازک کمر چال چٹ کیلی غضب ڈھاتی ہے لچکن
بچھوے کی جھنکار سرس بجتی ہے جب چلتی چھن چھن
ناجک بدن چندا مکھ بنری
گوری گوری بہیاں سبج رنگ چنری
گوری گوری بہیاں سبج رنگ چوڑیاں

جھم جھم جھمکے کلائی ہمار
ساٹھن کے لہنگے پہ گوٹہ چمکے
ماتھے پہ چمکے بندیا ہمار

علاقائی متن میں ''گوجریا' کے گورے گورے گلوا کا بیان لذت اور چاشنی سے بھرپور ہے اور اس بات کا ثبوت کہ عوام الناس کے ذہن میں جمالیات کا ایک بھرپور متحرک احساس رقصاں ہے۔

ان سارے متون کے حوالے اس لیے دیے گئے ہیں کہ ان میں بدن کا جمال موجزن ہے۔ تنقید دراصل متن کی جمالیات کی جستجو کا نام ہے۔ تنقید کا بنیادی مقصد تخلیقی جمالیات کا انکشاف و اکتشاف ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بارتھ کے حوالے سے بہت صحیح بات کہی ہے کہ......

''متن جسم ہے... اور قرأت کے دوران جسم، جسم سے بات کرتا ہے۔ جسم سے بارتھ ذہن کی لاشعوری کی کارکردگی مراد لیتا ہے۔ جسم، جو ادب کا کھرا اور سچا حصہ ہے۔ وہ قاری کی دسترس میں آجاتا ہے اور لطف و نشاط کے لیے گہرا ربط باہم ضروری ہے۔ متن یعنی اعلیٰ فن پارے کے تئیں قاری کے ردعمل کے لیے بارتھ دو اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔ pleasure اور enjoyment یعنی نشاط اور لذت۔ بارتھ کے انگریزی مترجم نے لکھا ہے کہ jouissance کے فرانسیسی مفہوم میں جنسی لذت کا اشارہ ہے اور بارتھ کی مراد اسی سے ہے۔ اصل متن اور اس کی سچی قرأت کا منتہا یہی کیفیت ہے۔ یعنی حظ و انبساط کی آخری حد۔ ڈوب جانے کی کیفیت، انضمام کامل، خودسپردگی، گمشدگی، یا تحیر ہی تحیر۔ بارتھ کہتا ہے کہ لطف و نشاط اور لذت کی اس کیفیت کا بیان ممکن ہی نہیں۔ نشاط کا بیان شاید ممکن ہو لیکن لذت کا صرف احساس کیا جاسکتا ہے اور بس...

بقول بارتھ جب ہم کسی سامنے کے صریحی معنی سے آگے بڑھتے ہیں تو گونج

پیدا ہوتی ہے، کوئی حوالہ، کوئی نسبت، کوئی تلازمہ، کوئی رمز و اشارہ، کوئی کنایہ، کوئی معنی در معنی، یا معنی در معنی کی کوئی دھندلی پرچھائیں۔ غرضیکہ متن کی سطردار سیدھی سادی معصومیت ٹوٹتی ہے اور سطروں کے بیچ میں جو کچھ ہے، بولنے لگتا ہے۔ بارتھ کا کہنا ہے کہ اس مقام پر گویا بخیہ ادھیڑنے لگتا ہے اور لباس کے چاک سے بدن جھانکنے لگتا ہے۔ the pleasure of the text کا مشہور جملہ ہے۔

"is not the body's most erotic zone

there where the garment leaves gaps"

یعنی ''کیا بدن کا وہ حصہ زیادہ جاذب نظر نہیں ہوتا جہاں ملبوس اسے ذرا سا کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ غرضیکہ یہ مقام شہوانی نشاط کا مرکز بن جاتا ہے۔ متن میں جب بھی اظہاری پیکر روش عام سے ہٹ کر اچھوتی زبان سے ملتا ہے تو بین السطور روشن ہو جاتا ہے اور ذہن ایک ناقابلِ بیان لذت سے ہمکنار ہوتا ہے۔''

(گوپی چند نارنگ — ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات)

متن بدن ہے، تو پھر تنقید کا کام، بدن کا اکتشافی مطالعہ ٹھہرا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب متن یعنی تخلیق سے تنقید کا مکمل اختلاط ہو، ظاہری نہیں، باطنی اختلاط... اس کے بغیر متن کی کلی جمالیات دریافت کرنا ناممکن ہے۔ دو مختلف وحدتیں تخلیق اور تنقید مل کر جب تک ایک نئی وحدت میں گم نہ ہو جائیں۔ اسے مکمل وصال کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لیے ہمارے یہاں 'کچے وصال' کے نتیجے میں جو تنقید جنم لے رہی ہے وہ بہت ہی نحیف و ضعیف ہوتی ہے۔ تنقید تو دراصل اس orgasm کا نام ہے جو متن کا منتہا ہے۔ ایک اچھے ناقد ہی کی اس orgasm تک رسائی ممکن ہے۔ متن بہت ہی پُراسرار اور طرح دار ہوتا ہے۔ اس میں ڈھیر سارا رس اور بہت سارا آنند بھرا ہوا ہے۔ رس اور آنند کی دریافت ہی تنقید ہے۔

سلیم احمد ایک ایسے نقاد ہیں جنہوں نے متن کو بدن کی طرح پڑھا ہے۔ ان کے نزدیک متن ایک لمسی اور مرئی شے ہے۔ بدن میں جتنے بھاؤ ہوتے ہیں اور جتنے رس، اتنے ہی متن میں بھی ہوتے ہیں۔ متن کثیر المعنیاتی ہوتا ہے۔ سلیم احمد کا مشہور جملہ کہ عورت کی طرح شاعری بھی پورا آدمی مانگتی ہے، محض رومانوی فقرہ بازی نہیں بلکہ اس جملے کی تہہ میں تنقیدی بوطیقا کی مکمل جمالیات مضمر ہے۔ ایک ایسا تنقیدی وژن ہے، جس نے یہ احساس دلایا کہ اچھی تخلیق اسی وقت جنم لے سکتی ہے جب تخلیق کرنے والا قوت مردانگی سے بھرپور ہو۔ اس کے اندر قوتِ رجولیت ہو، ورنہ تخلیق لُج لجی، نحیف، لاغر، ناتواں ہوگی۔ تخلیق پُرش اور پراکرتی کے اتصال یعنی شیو اور پاروتی کے وصال سے ہی مکمل ہوتی ہے۔ سلیم احمد نے یہاں تخلیقی عمل کی یکسانیت کا احساس دلا کر یہ ثابت کیا ہے کہ معاملہ خواہ کائنات کی تخلیق کا ہو یا ادب کی تخلیق کا، تخلیقیت کے عمل میں دونوں مساوی ہیں۔ دونوں ایک ہی تخلیقی پروسیس سے گزر کر نمود وظہور میں آتے ہیں۔ جس طرح بدن میں کئی بدن چھپے ہوتے ہیں، اسی طرح متن میں بھی کئی متن اور اس کے مفاہیم و مطالب مضمر ہوتے ہیں۔ بدن کی جس طرح الگ الگ جمالیاتی تعبیرات پیش کی جاتی ہیں، ایک ایک انگ کی کئی کئی تعبیریں تلاش کی جاتی ہیں، اسی طرح متن کی جمالیاتی تعبیرات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ متن اور بدن کے اس گہرے انسلاک اور تلازمہ کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے میرؔ اور غالبؔ کا متن ہے۔ مگر ان دونوں کے متن کی جمالیاتی تعبیرات مختلف اذہان رکھنے والوں نے اپنے اپنے فہم و ادراک کے مطابق کی ہیں، ہر ایک کے یہاں متن کی الگ الگ معنیاتی جمالیات ابھرتی ہے اور یہ متن کی کثیر المعنویت پر دال ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اُردو تنقید کا جو نیا جمالیاتی نظام وضع کیا ہے، وہ نظام اس لحاظ سے مکمل، جامع اور مانع ہے کہ اس میں تخلیقی جمالیات کی جانچ پرکھ کرنے والے عناصر من کل الوجوہ سمٹ آئے ہیں۔ تخلیق کے بطون میں پوشیدہ حسن کا ادراک کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ تنقید کی جو نئی جمالیاتی بوطیقا پروفیسر نارنگ نے

تشکیل دی ہے، وہ روحِ عصر کے عین مطابق ہے اور آج کے تمام تر جمالیاتی فنی مطالبات اور تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے تنقید میں بدن کے ساتھ ساتھ اس کی آتما کو بھی دریافت کرلیا ہے۔ ان کی تنقید میں بدن، اپنی تمام تر sensuousness کے ساتھ موجود تو ہے ہی، بدن کی حساسیت کی بائیدگی، اس کی لطیف انتر آتما بھی ہے جس تک تلاشِ بسیار ریاضت دشوار کے بعد بھی ناقدین کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ بہت تپسیا کے بعد پروفیسر نارنگ کو نقد کے سدرۃ المنتہیٰ تک رسائی نصیب ہوگئی ہے۔

سب سے زیادہ جمالیاتی نقوش و مظاہر افسانوں میں ملتے ہیں۔ نارنگ صاحب نے فکشن کی تنقید لکھتے ہوئے ان جمالیاتی مظاہر کو پس پشت نہیں ڈالا بلکہ پیش نظر رکھا ہے۔ مثلاً کرشن چندر کی افسانوی نثر کے حوالے سے ان کا یہ ریمارک کہ ''ان کی نثر دلہن کی طرح سجیلی اور جاذب نظر ہے۔ لیکن اس کی سحر کاری اور دلآویزی زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتی۔'' اس بات کا مظہر ہے کہ پروفیسر نارنگ کی نظر میں متن کی کئی جمالیاتی پرتیں ہیں۔ ایک دلہن کی طرح جو ہوسکتا ہے کسی کے لیے جاذبِ نظر بھی ہو مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر ایک کی نظر اُسی پہ ٹکی رہے۔ نارنگ صاحب کا کرشن چندر کے متن کو بدن کے تجسیمی حوالے سے پرکھنا، صاف ظاہر کرتا ہے کہ متن کی جمالیات، بدن کی جمالیات سے مختلف نہیں ہے۔

کسی بھی تخلیق کی جمالیات اسی وقت ابھر کر سامنے آتی ہے جب تنقید نگار کو بھی جمالیاتی عرفان و ادراک ہو۔ تنقید میں جمالیاتی عمل کی کارفرمائی سے ہی تخلیق کی جمالیات اُجاگر ہوتی ہے۔ پروفیسر نارنگ کے نقد میں سارے جمالیاتی عناصر ہیں۔ اسی لیے وہ متن کی گہرائیوں میں اتر کر متن کی جمالیات کا عرفان حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ نارنگ صاحب اپنی تنقید میں بدن سے بیگانگی کا نہیں بلکہ اس سے مکمل ارتباط کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کی تنقید میں بدن اسی طرح روشن ہے جیسے اندھیری رات میں چاندنی کا لمس۔

راجندر سنگھ بیدی پر لکھتے ہوئے فکشن کی جمالیات کے حوالے سے انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ ظاہر کرتا ہے کہ تنقید میں ان کا منفرد جمالیاتی نظام ہے۔ بدن ان کے لیے ایک حد درجہ فعال، متحرک تخلیقی عنصر ہے اور ان کا خیال ہے کہ بدن کے بغیر متن نامکمل ہے۔ اس مضمون میں نارنگ صاحب نے اپنے جمالیاتی موقف کو واضح کردیا ہے۔ وہ جسم جمال مظاہر سے قطعی گریزاں نہیں۔ وہ لکھتے ہیں......

''اپنے دکھ مجھے دے دو'' میں بنیادی کردار کا نام اندو ہے۔ اندو پورے چاند کو کہتے ہیں جو مرقع ہے حسن و محبوبیت کا اور جو پھلوں کو رس اور پھولوں کو رنگ دیتا ہے، جو خون کو ابھارتا ہے اور روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے۔ اندو کو سوم بھی کہتے ہیں۔ جو سوم رس کی رعایت سے آبِ حیات کا مظہر ہے جس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ کہانی میں اندو کا جوڑا مدن ہے۔ مدن لقب ہے عشق و محبت کے دیوتا کام دیو کا۔ اندو کو بیدی نے ایک جگہ رِتی بھی کہا ہے جس سے ذہن پھر کام دیو کی طرف راجع ہوتا ہے۔ رگ وید (x129) میں کام دیو کو وجود کا جوہر primal germ of mind کہا ہے جس سے کائنات کی تخلیق ہوئی۔ یونانی صنمیات میں eros یا کیوپڈ کا تصور بھی اس حیثیت سے آیا ہے۔ گویا کرداروں کے ناموں ہی سے سرشٹی کے مثبت اور منفی عناصر کے ملنے اور تخلیق کے لامتناہی عمل کے شروع ہونے کا آفاقی احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ کہانی کا بنیادی خیال عورت مرد کی کشش کا پُراسرار عمل ہے۔ بیدی کا ذہن چونکہ دیو سے زیادہ دیوی کی طرف یا تہذیب کے آبائی تصور سے زیادہ مادری تصور کی طرف راجع ہے۔ اس لیے تخلیق کے اس ازلی اور ابدی عمل میں بنیادی اہمیت مرد کو نہیں عورت کو حاصل ہے۔ مدن محض آلہ کار ہے۔ تخلیقی عمل کی تکمیل کا، جنسی کشش کی تشخیص کا یا اندو کو بتدریج ادھورے سے پورا بنانے کا۔ اندو موضوع ہے، مدن اس کا معروض۔ محبت کی موضوعی جہت کے علاوہ اندو کی دوسری جہتیں

اور شانیں بھی ہیں۔ وہ بیٹی بھی ہے، بیوی بھی ہے اور ماں بھی۔ لیکن اول و آخر وہ ماں ہے یا پھر عورت جس کے تصرف میں ساری کائنات ہے اور جس کی ذات ذرّہ ذرّہ میں چھپی ہوئی اور چاند ستاروں میں بسی ہوئی ہے اور دھرتی بن کر جس نے آکاش کو اپنی بانہوں میں جکڑ رکھا ہے۔ بیدی جگہ جگہ گوشت پوست کی اندو کی ازلی اور ابدی عورت سے تطبیق کرتے ہیں۔''

نارنگ صاحب آگے رقمطراز ہیں......

''اگرچہ عورت کا یہ ہمہ گیر آفاقی تصور اپنی اصل کے اعتبار سے شومت کے شکتی اور تانترک عقائد سے ملتا جلتا ہے لیکن کہانی کی ساری فضا ویشنومت سے ماخوذ ہے۔ دروپدی ساوتری اور سیتا سب ویشنوی تصورات ہیں۔ ویشنوؤں کے خاص منتر، اوم نمو بھگوتے واسودیوایا'' سے بھی کئی موقعوں پر فضا سازی کی گئی ہے۔ اس میں واسودیوا سے مراد کرشن ہیں جو واسودیو کے بیٹے اور وشنو کے آٹھویں اوتار مانے جاتے ہیں۔ بچے کی پیدائش کا دن بھی وجے دشمی ہے جو رام کے تعلق سے وشنو تہوار ہے۔ ویشنومت کے ان حوالوں کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ بہ خلاف ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کے ''ایک چادر میلی سی'' کی ساری اساطیر کی فضا شیومت سے ماخوذ ہے۔ ناول کا مرکز و محور یہاں بھی عورت ہے، روح کائنات اور تخلیق کی امین، لیکن اس تصور میں ہلکا سا فرق زاویہ نگاہ emphasis کا ہے۔ وہاں زور اس بات پر تھا کہ عورت زندگی کا زہر پی کر مرد کے لیے امرت فراہم کرتی ہے یا دکھ سہتی اور سکھ دیتی ہے۔ اس کے برعکس ''ایک چادر میلی سی'' میں واضح طور پر معاملہ عورت کے مرد کو قابو میں لانے اور تولید نسل کے تخلیقی عمل میں اس سے اپنے قرض کے وصول کرنے کا ہے۔ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' میں اندو کبھی دروپدی تھی کبھی ساوتری اور کبھی جنک دلاری سیتا۔ یہ سب کے سب عورت کے مثبت روپ ہیں، محبت، ایثار، عزت، عصمت اور

پاکیزگی کی اساطیری روایات سے جگمگاتے ہوئے۔ لیکن ان کے مقابلے پر ''ایک چادر میلی سی'' میں رانو کے تصور میں مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔ ناول کی ساری فضا خون سے لت پت اور تشدد کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ جس کا تعلق واضح طور پر شکتی پوجا، تانترک عقائد، خون کی قربانی اور قتل کی روایت سے ہے۔ ناول کے پہلے جملے ہی یہی ہیں۔''

نارنگ صاحب، کہانی کی اساطیری جمالیات کو یوں ابھارتے ہیں......

''بیدی کی کہانیوں میں سے ''میتھن'' میں جو کھجوراہو کے مندروں کی جنسی وحدیت کی فضا ہے، اس میں جنس کو اکائی کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مرد اور عورت جنس کے دو پہلو ہیں، توام، آپس میں جڑے ہوئے۔ جیمنی میں جڑواں ستاروں کا تصور یونانی اور مصری اساطیر میں بھی ملتا ہے، لیکن اس کی ثنویت میں وحدیت دیکھنا ہندوستانی ذہن سے متعلق ہے۔ بیدی نے اپنے مخصوص انداز میں جنسی انجذاب کی وحدت میں تخلیق کائنات کی مابعدالطبعیاتی وحدانیت کی جو معنوی فضا پیدا کی ہے وہ ان کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔''

''اس بات کی شکایت عموماً کی جاتی ہے کہ بیدی اب جنس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس طرح اوپر کے تجزیے سے یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ دیومالا سے مدد لینے کا رجحان بیدی میں شروع سے تھا لیکن آزادی کے بعد یہ باقاعدہ طور پر ان کے فن کا حصہ بن گیا، اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ جنس کے بارے میں لکھنے کا مادہ بیدی میں پہلے سے تھا۔ گرہن کی چودہ کہانیوں میں سے سات کے مرکزی خیال کا جنس سے گہرا تعلق ہے، لیکن آزادی کے بعد اس نے ایک بھرپور رجحان کی شکل اختیار کرلی۔ یہ سوچنا غلط نہیں ہے کہ بیدی کو ہندوستانی اساطیری روایات کے ساتھ شروعات ہی سے جو دلچسپی رہی ہوگی، وہ آزادی کے بعد کئی گناہ بڑھ

گئی ہے۔ انہیں ہندوستانی ذہن کے تصورِ جنس کا بھی گہرا احساس رہا ہوگا۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ قدیم ہندوستان کا تصورِ جنس، سامی تصورِ جنس اور جدید مغربی تصورِ جنس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ یہ بہت ہی آزادانہ، کھلا ڈلا اور بھرپور ہے۔ روح کی لطافت سے شاداب اور خون کی حدت سے تھرتھراتا ہوا۔ سامی تصور کی سخت گیری جو مجازی لگاؤ کو شجرِ ممنوعہ قرار دیتی ہے، یہاں نام کو بھی نہیں۔ بے شک جسمانی لذت اور حواس کی سرشاری اس کا نقطۂ آغاز ہے لیکن یہ کیفیت اس ہوس ناکی اور سفلہ پن کی طرف نہیں لے جاتی جو مغربی مزاج سے مخصوص ہے۔''

''جسمانی حسن کے آزادانہ اور بے باک اظہار کی وجہ سے ہندوستانی تصورِ جنس میں عریانیت کے وہ معنی ہی نہیں، جن سے ہمارے موجودہ ذہن آشنا ہیں۔ شیوشکتی اور وشنومت جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے، ہندوستان میں اساطیر کی دو اہم ترین روایتیں ہیں اور دونوں میں جنس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ شیوشکتی کے سلسلہ میں یونی اور لنگم کی پرستش کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ کرشن کی راس لیلا کا مرکز و محور بھی جنس ہے۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ شیوشکتی کے تصور میں دراوڑی ذہن کی کھردری ارضیت کا پہلو نمایاں ہے اور کرشن کی راس لیلا یا سیتا اور رام کے تعلقات میں آریائی ذہن کی آسمانی لطافت کا پہلو نمایاں ہے۔ ان اساطیری تصورات کے علاوہ بیدی کے سامنے ہندوستانی فنونِ لطیفہ کی روایتیں بھی ہیں۔ ہندوستانی مصوری، سنگ تراشی اور موسیقی میں جنس کا عمل دخل دنیا کی کسی بھی تہذیب سے کہیں زیادہ ہے، یہاں راگ راگنیاں بھی حسیناؤں کے پیکر میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں۔ کھجوراہو یا کونارک کی سنگ تراشی ہو یا اجنتا، ایلورا باگھ اور ایراوتی کی مجسمہ سازی یا نقاشی، ہر جگہ جنس کا اظہار آزادانہ اور بھرپور طریقے پر ہوا ہے، اس میں لذت کا پہلو یقیناً ہے۔ لیکن اس عظیم مسرت

کے روپ میں جو انسان کو فطرت کا سب سے اہم تحفہ ہے۔ دراصل سارا معاملہ تخلیق کے لامتناہی عمل کا ہے۔ ہندوستانی روایت میں جنس کے جسمانی پہلو کو اس کے روحانی پہلو سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جاتا۔ یا پھر یوں کہا جا سکتا ہے کہ جنس کے جسمانی پہلو کی کچھ اس طرح سے تطہیر اور تقدیس کر دی گئی ہے کہ عریانیت نہیں رہی۔ بیدی کے ہاں جنس کے ذکر کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کی معنویت ہی دوسری ہو جاتی ہے۔''

بیدی کی ''لمبی لڑکی'' اور ''ٹرمینس سے پرے'' کا تذکرہ کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ اس طرح لکھتے ہیں......

''یہ لے آسانی سے شہوانی (erotic) حدوں کو چھو سکتی ہے، لیکن کتھا سرت ساگر، ہتو اُپدیش، شکاسپ تتی اور پرانوں کے سیکڑوں ہزاروں قصے کہانیوں میں شہوانیت (eroticism) کا وہ کون سا پہلو ہے جو بیان نہیں ہوا۔ ان میں عورت کی فطرت اور جسمانی مسرت کے سربستہ رازوں کو کھولنے کی مسلسل کوشش ملتی ہے۔ ہندوستان کے کلاسیکی ادب کے سرمایہ میں جو مخصوص بیبا کی (openness) پائی جاتی ہے، وہ چٹخارے کے لیے یا محض اکسانے کے لیے نہیں، اس کا تعلق جسمانی مسرت کی گہری باخبری (awareness) سے ہے۔ بیدی کے ہاں جنس کا ذکر زیادہ تر اسی لحاظ سے آتا ہے۔ جہاں معاملہ فطرت کے دل کی دھڑکنوں کو سننے، جسمانی کیف و سرور کے عظیم معمے کو سمجھنے، عورت اور مرد کے تعلقات کی بھول بھلیوں کے بھید کو جاننے اور کائنات میں اتصال باہمی کی پُراسراریت کی گرہیں کھولنے کا ہو، وہاں جنس کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ناگزیر ہے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ''منٹو کا متن — ممتا اور خالی سنسان ٹرین'' میں بھی اپنے جمالیاتی موقف کا اظہار چابک دستی سے کیا ہے۔ منٹو کی کہانی 'بو' کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، اس میں تنقید کا بدن بولتا نظر آتا ہے۔ وہ متن کی جمالیات کی گہرائیوں میں

اتر کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں......

''گھاٹن عورت پوری کہانی میں شاید ایک لفظ بھی نہیں بولتی۔ فقط جب بارش میں شرابور چولی کی گانٹھ اس سے نہیں کھلتی تو وہ منہ ہی منہ مراٹھی میں کچھ بڑبڑاتی ہے۔ پوری کہانی میں سوائے اس ایک لفظ کے خاموشی ہے اور یہ خاموشی اور گھاٹن کا خاموش وجود وہ 'آواز' ہے جو کہانی میں گہری معنویت قائم کرتی ہے۔ اس کہانی کو موسموں کے آنے جانے، بارش کی بوندوں کے گرنے اور دھرتی کی پیاسی کوکھ کے بھیگنے یا پرش اور پراکرتی کے ملاپ کی تعبیر کے طور پر بھی پڑھا جاسکتا ہے اور اس میں ایک عجیب مسرت اور وارفتگی ہے۔ منٹو نے تخلیقی محویت میں کہانی کو جس طرح بنا ہے، اس میں بادلوں کے گھر آنے اور پیپل کے پتوں کے سرسرانے اور ننھی ننھی بوندوں میں بھیگنے کا بار بار ذکر آتا ہے، یوں گھاٹن بطور 'پراکرتی' بار بار ذہن کے پردے پر اُبھرتی ہے... ''برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے... رات کے دودھیا اندھیرے میں جھومروں کی طرح تھرتھرا رہے تھے... جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر رونگٹے نے اس لڑکی کے بدن کے چھڑے ہوئے تاروں کی بھی آواز سنی تھی، مگر وہ آوازیں کہاں تھیں؟ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے بدن کی بو میں سونگھی تھی... وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے زیادہ مسرور کن ہوتی ہے، وہ پکار جو حلقہ خواب سے نکل کر بے آواز ہوگئی تھی۔''
اسی طرح کہانی کے آخر میں جب گھاٹن نہیں بلکہ گوری چٹی لڑکی... جس کا جسم دودھ اور گھی میں گندھے ہوئے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی ہوئی ہے، تب پھر برسات کے یہی دن تھے۔ ''رندھیر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بالکل قریب ہی پیپل کے نہائے ہوئے پتے جھوم رہے تھے۔ وہ ان کی مستی بھری کپکپاہٹوں کے اس پار کہیں بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا،

جہاں مٹ میلے بادلوں میں عجیب و غریب قسم کی روشنی گھلی ہوئی دکھائی
دے رہی تھی...... ٹھیک ویسے ہی جیسی اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے
نظر آئی تھی۔ ایسی روشنی جو پُراسرار گفتگو کی طرح دبی دبی لیکن واضح تھی۔''
اس کہانی کو جنسی تلذذ کی کہانی کے طور پر پڑھنا منٹو کی توہین کرنا ہے۔
پوری کہانی میں گھاٹن کا تصور جسمانی کم اور ارتفاعی زیادہ ہے...... ''مٹ
میلے رنگ کی جوان چھاتیوں میں جو بالکل کنواری تھیں، ایک عجیب و
غریب قسم کی چمک پیدا ہوگئی تھی جو چمک ہوتے ہوئے بھی چمک نہیں تھی۔
اس کے سینے پر یہ ابھار دو دیے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی
پر چل رہے تھے۔''

''رندھیر 'پرش' ہے اور گھاٹن 'پراکرتی' جو بظاہر بے تفاعل ہے لیکن
پورے وجود کو بانہوں میں لیے ہوئے ہے اور سکھ اور آنند کی دینے اور
لینے والی ہے۔''

پس ثابت ہوا کہ پُرش اور پراکرتی کے ملن سے ہی تخلیقی جمالیات کی تکمیل ہوتی
ہے۔ نارنگ صاحب کا یہ کہنا بجا ہے کہ:

''منٹو کے افسانوں کا جمالیاتی اثر اسی لیے ہے کہ زندگی کے بھید بھرے
سنگیت میں وہ علم، دردمندی اور کرونا کے کچھ ایسے سروں کے نقیب ہیں جو
کارخانہ قدرت کے بنیادی آہنگ کا حصہ ہیں۔''

نارنگ صاحب کو بدن سے بیر نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے منٹو پر لکھتے ہوئے
ان کے وہ سارے حوالے اپنے متن میں پرو کر روشن کر دیے ہیں جو فحاشی اور عریانی سے
متعلق ہیں۔ مثلاً ایک جگہ منٹو کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ......

''عورت مرد کا رشتہ فحش نہیں، اس کا ذکر بھی فحش نہیں۔ اگر میں عورت کے
سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ ہی کہوں گا۔ مونگ پھلی، میز یا
استرا نہیں کہوں گا۔'' اسی طرح منٹو نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''میں تہذیب و

تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی بھی کوشش نہیں کرتا۔ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا کام ہے۔''

نارنگ صاحب نے منٹو کے افسانہ کی جمالیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ......

''منٹو کا محرک بہرحال جسم و جمال یا لذت کاری نہیں بلکہ روح کی ویرانی و بے سروسامانی ہے یا وہ سوناپن اور سناٹا جو روح میں ہول پیدا کرتا ہے اور جہاں موت کا آسیب لہراتا رہتا ہے۔''

منٹو کا افسانہ 'بو' کے حوالے سے نارنگ صاحب نے منٹو ہی کا ایک قول نقل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ منٹو کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت بھی ہے اور ان کی تنقیدی جمالیات کا مظہر بھی۔ وہ ان مدیران کے بارے میں لکھتے ہیں جنہوں نے ''بو'' پر مقدمے کی حمایت میں لکھا تھا کہ......

''افسوس صرف اتنا ہے کہ یہ پرچے ایسے لوگوں کی ملکیت ہیں جو عضو خاص کی لاغری اور کجی کو دور کرنے کے اشتہار خدا اور رسول کی قسمیں کھا کھا کر شائع کرتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ صحافت جیسے معزز پیشے پر ایسے لوگوں کا اجارہ ہے جن میں سے اکثر طلا فروش ہیں۔''

نارنگ صاحب کے ان مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تنقید میں متن کی جمالیات تلاش کرنے کے عمل پر قادر ہیں اور انہوں نے متن کی جمالیات کو دریافت کر کے ہی اسے تنقیدی فنکاری کے معیار پر پرکھا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' بھی دراصل اسطوری جمالیات کی تلاش کی ایک سعی بلیغ ہے۔ اردو مثنویوں کا متن جمالیات سے بھرپور ہے۔ ان مثنویوں میں بدنی جمال کی دلآویزیاں بھی ہیں اور حسن خیال کی رعنائیاں بھی۔ بدن شہر کی طلسم کاریاں بھی۔ مثنوی نل و من (احمد سراوی) کے تذکرے میں نارنگ صاحب لکھتے ہیں......

''احمد سراوی نے نل کا سراپا بڑی خوبی اور چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

عریانی نام کو نہیں لیکن سراپا نگاری کی قدیم روایت کو زفرق تا بقدم پوری طرح نبھایا ہے۔ مثنوی کی زبان ابتدائی زمانے کی ہے اور مخلوط ہریانی کی وجہ سے ادق اور اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ اگر غور کیجیے تو اس بت طناز کی تصویر کشی میں شاعر نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ہر نقش زندہ ہے اور ہر خط دلکش، تشبیہ اور استعارے صاف، پُر زور اور معنی خیز، گو شاعر کے سامنے فارسی مثنوی تھی۔ پھر بھی جمالیاتی احساس کی فضا میں ہندوستانی رنگ صاف جھلکتا ہے۔''

کیا بات کہوں بھونگ کارے　　چندن پی کریں کلول سارے
وہ مانگ سفید جگمگاوے　　بگ پانٹ گھٹا منے آوے
کیا وصف کروں میں اس جبیں کا　　ماتھا نہیں چاند چودھویں کا
وہ نین گویا کھجن کے جوڑے　　سرخ سیاہ و سفید ڈورے
دو جانگ گویا کشیدہ شمشاد　　قد راست مثال سرو آزاد
کیا حسن کہ آگ کا بھبوکا　　لوٹا ہے قرار ہر کسو کا
سر کھول پری اگر اٹھا دے　　دن رات کو ایک ہی دکھا دے

مثنوی ستیہ وان ساوتری میں بھی نارنگ صاحب کو وہی نگار خانہ جمال رقصاں نظر آتا ہے اور وہ مثنوی کی زبانی، حسن نظر سوز کے عالم کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں......

چہرہ کہ کنول کھلا ہوا تھا　　یا پھول کوئی گلاب کا تھا
بوٹا سا. وہ قد بدن سنہرا　　کندن سا دمک رہا تھا چہرا
وہ آنکھ کا حسن روح پرور　　بھورا سا کنول کی پنکھڑی پر
تھے لعل لب اس طرح نمایاں　　گل نار کی جیسے سرخ کلیاں
تھا جان وفا حیا کا انداز　　تھا جسم لطیف صورت راز
جب غنچۂ لب کو کھولتی تھی　　ہر بات میں قند گھولتی تھی
رفتار نسیم کو بھی شرمائے　　اک موج شراب اٹھ کے رہ جائے

مثنوی سسی پنوں میں سسی پری تمثال کا سراپا کھینچا ہے اور مثنوی چندر بدن مہیار میں بھی چندہ حسینی واقف نے چندر بدن جیسے گل بدن 'غنچہ دہن' رشک چمن کے سراپے میں ایک سو سات اشعار کہے ہیں۔ یہ اس بات کا مظہر ہیں کہ قدیم ذہن جمالیاتی تحرک سے آشنا تھے اور انہوں نے جمالیات کے سلسلے کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور یہ جمالیات ہماری ادبی روایت کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس سے اگر جمالیات کو منہا کردیا جائے تو ادب کے پاس کچھ باقی نہیں بچے گا۔ گوپی چند نارنگ نے ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویوں میں بار بار اس متن کو تلاش کیا ہے جو ہندوستانی جمالیات کا سرچشمہ ہے۔ یہ متن لذت بخش بھی ہے اور نشاط انگیز بھی۔ یہ ایسا متن یعنی جسم ہے جس پہ قاری کی نظر ٹھہر ٹھہر جاتی ہے۔

جس طرح ہر آرٹ پورا آدمی مانگتا ہے، تنقید بھی پورا آدمی مانگتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کے تنقیدی حاصلات و امتیازات پر غور کیا جائے تو بآسانی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نارنگ صاحب تنقید کے آدھے ادھورے آدمی نہیں بلکہ ان کی شکل میں تنقید کا وہ پورا چاند طلوع ہوگیا ہے جسے کوئی گرہن نہیں لگ سکتا۔ ان کی تنقید پدمنی تنقید کی عمدہ مثال ہے۔ وہ پدمنی جس کے جمال کی تفسیر پدماوت میں بیان کی گئی ہے۔ نارنگ صاحب کی تنقید میں وہ تمام تر حسن کاری اور جمالیاتی وحسی پیکر آفرینی ہے جس سے پدمنی مالا مال تھی۔ ملک محمد جائسی نے پدماوت میں پدمنی کے حسن و جمال کا جو بیان کیا ہے، اس کا اطلاق نارنگ صاحب کی تنقید پر بھی ہوتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ نارنگ صاحب کی تنقید کا شریر چندر کی سولہ کلاؤں کے سوندریہ سے بنا ہے۔ اس کی کایا بارہ بانی کندن کی طرح شدھ اور چمکیلی ہے۔ نارنگ صاحب کی پدمنی تمثال تنقید سے یقیناً تنقید کی جس لطیف جمالیات نے جنم لیا ہے، اس کی مثال اردو تنقید میں کم ملتی ہے۔

○○

— افتخار امام صدیقی

اپی لاگ

جسم و بدن آکار داستانیں، ازل سے ابد تک کی ہیں۔ دنیا کا قیام اور زمین پر اتارے گئے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اور انہی کی بائیں پسلی سے تولد ہوئیں بی بی حوا اور پھر ان دونوں کے اتصال سے مرد اور عورت کی افزائش کے سلسلے شروع ہوئے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ آدم و حوا جنت نشیں تھے۔ اللہ نے ایک ممنوعہ درخت کے پھل کھانے سے منع فرمایا تھا لیکن شیطان مردود ملعون نے آدم علیہ السلام کو ورغلایا اور انہوں نے بی بی حوا کے ساتھ وہ پھل کھالیا۔ اللہ نے بطور سزا ان دونوں کو زمین پر اُتار دیا۔

آدم و حوا کی داستانیں تب ہی سے جاری ہیں۔ ممنوعہ پھل دراصل جنس کی علامت ہے۔ یہ ایک فلک بھر موضوع ہے جس کا احوال آسمانی صحائف، دیگر مذاہب کی کتابوں، احادیث نبوی میں مختلف مسائل کے ساتھ ملتا ہے۔

اس سے قبل کہ میں اس موضوع پر اپنے 'علم بھر' تاثرات تحریر کروں، یہ واضح کر دینا ازبس ضروری سمجھتا ہوں کہ میری شاعری اور نثر میں مرد اور عورت کے لیے ''جسم اور بدن'' دو الگ الگ اوصاف کے حامل سراپا ہیں۔ حالانکہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ اردو شاعری اور نثر میں دونوں کا استعمال شعر اور نثر میں وزن و بحر اور کلمے کی ساخت اور اس کی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔ ایسی تقسیم تو پوری اردو شاعری میں کسی نے بھی نہیں کی۔ فارسی زبان کی شاعری میں تذکیر و تانیث کے الجھاوے نہیں ہیں۔ اس شاعری میں

تو مذکر ہی معشوقہ اور محبوبہ ہے جسے معشوق اور محبوب کہا گیا اور غزل چونکہ ایران سے برآمد کی گئی ہے لہٰذا معشوق اور محبوب بھی مذکر ہی ہے۔ وَلی، مِیر، غالِب، سَودا، ذوق، مومن، مصحفی، میر دَرد، میر سوز، داغ، امیر مینائی، اقبال، سیماب، فراق، فیض اور مابعد شعرا کے یہاں فارسی غزل کے موضوعات اور تذکیری اظہاریے ملتے ہیں۔ آج بھی عالمی اردو غزل فارسی کے اثرات سے نکل نہیں سکی ہے۔ حالانکہ جو عالمی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں اور اس کے مسائل ''شعر بند'' ہورہے ہیں، وہ چاہے رومانی غزل ہو، یا سیاسی، سماجی سروکار والی غزلیں، پابند نظم کا معاملہ جداگانہ ہے۔ جدید نظم کے بانی علامہ اقبال، سیماب اور جوش، چکبست ہوئے ہیں۔ ان کے بعد میراجی، ن۔م۔ راشد، مجید امجد، مختار صدیقی، یوسف ظفر، اختر الایمان وغیرہم کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ مابعد شعراء میں سردار جعفری، فیض، کیفی، اعجاز صدیقی، وامق اور خلیل الرحمٰن اعظمی کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

نئی غزل میں تذکیر و تانیث کے فرق کو شاعرات نے واضح رکھا، اس کی سب سے بڑی مثال پروین شاکر مرحومہ اور داراب بانو وفا ہیں۔ پروین شاکر نے اردو کی نسائی شاعری کا اسلوب، آہنگ اور لہجہ تبدیل کیا اور مابعد نسائی شاعری کو ایک واضح ڈگر سے روشناس کروایا۔ ہندوپاک میں اردو کی نسائی شاعری پروین شاکر کی شاعری کا پرتو لگتی ہے۔

معاصر عالمی اردو ادب نے جنس کو ''ممنوعہ شجر'' بنائے رکھا ہے۔ ماضی میں سعادت حسن منٹو کے یہاں جو تخلیقی افسانے تحریر کیے گئے، انہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان افسانوں پر آج بھی تحقیقی کام ہورہا ہے۔

راقم الحروف نے 'جنس' کو موضوع کرتے ہوئے نظمیں آزاد، پابند، نثری بعد ازاں غزلیں، افسانے، تخلیق کیے ہیں۔ میری کچھ نظمیں، استعارہ، شاعر، نیا ورق اور مباحثہ میں شائع ہوچکی ہیں۔ میرے بزرگ دوست محمد سالم صاحب نے اردو نظموں کا انگریزی روپ دینا شروع کیا ہے۔ انگریزی میں دوبارہ تخلیق کی جانے والی نظمیں شاعر، انتساب، توازن اور دیگر ادبی رسائل میں شائع ہوچکی ہیں۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

جنس کے موضوع پر متقدمین شعرا کی شاعری سے اشعار منتخب کیے جاسکتے ہیں۔ متوسطین شعرا کے یہاں سے بھی ایسے ہی یادگار شعر لیے جاسکتے ہیں۔ فراق گورکھپوری کی روپ کی رباعیاں اور جاں نثار اختر کی ''گھر آنگن'' رباعیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ راقم الحروف نے بھی علامتی اور استعاراتی، رمز و کنایہ میں ۷۵ رباعیاں تخلیق کی ہیں۔ ابھی یہ عمل جاری ہے۔

سہ ماہی استعارہ (دہلی) میں برادرم حقانی القاسمی نے بدن کی جمالیات کے موضوع پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس کے ذیل میں راقم کی نظمیں بھی شائع ہوچکی ہیں۔ اب حقانی کے مذکورہ مضامین 'کتاب بند' ہورہے ہیں تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس موضوع پر ایک مقالہ لکھوں اور اپنی مطبوعہ وغیر مطبوعہ نظموں کے ساتھ ارسال کروں۔ نظمیں، غزلیں تو لاتعداد ہیں، اور رباعیاں بھی ہیں جو فراق اور اختر سے یکسر مختلف ہیں۔

'بدن کی جمالیات' کا تعلق ہر عورت اور مرد کی 'وجدان بھر' سوچ سے علاقہ رکھتا ہے اور اس میں جنس کا تناظر ناگزیر ہے۔

یہاں میں اس مفروضے کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف اتنا عرض کردوں کہ 'بدن بھر' کشش کے عالمی معیار بے شمار ہوسکتے ہیں لیکن راقم کے یہاں یہ ایک پُراسرار جذبہ الگ کینوس رکھتا ہے جس کی نہ تو زبان ہے اور نہ کوئی فرہنگ، اسے صرف جسم و بدن ہی محسوس کرسکتے ہیں۔ کون جسم، کس طرح کے بدن کو پسند کرتا ہے، یہ تو جسم و بدن کے سربستہ راز ہیں۔

کلاسیکی شعرا نے اپنی پسند کے 'بدن' شاعری میں کینوس کیے تھے لیکن ان کے یہاں 'بدن' جسم میں تبدیل ہوکر لونڈا یا لڑکا بن جاتا ہے۔ ویسے ایک کم سن لڑکا، جس میں نسوانیت کے ہلکے آثار پائے جاتے ہیں، پُرکشش لگتا ہے۔ میر تقی میر نے ایک مصرعے میں اس کو واضح کردیا ہے۔

اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

رئیس المتغزلین میر تقی میر نے ایک ایسا شعر بھی اردو غزل کو دیا ہے کہ اس کے بطن

سے میری شاعری کے زمزمے، آبشار بنے ہیں۔

اس جائے سراپا پہ نظر جاتی ہے جس دم
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر ہو

اس سے قبل کہ میں اپنی شاعری سے شعر پیش کروں، کچھ ایسے شعرا کا ذکر کروں گا جن کا جنسی کلام 'سینہ بہ سینہ' چلا آرہا ہے۔ ان میں رفیع احمد خاں کا بیشتر کلام برادرم نیر مسعود کے پاس ذخیرہ ہے۔ دوسرا نام مائل ملیح آبادی کا ہے، اُن کی شاعری کے حافظ بہت سارے ممبئی میں ہیں لیکن ان کا سارا کلام کسی کے پاس ہوگا، وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔ ایک اور نام مرحوم عیسیٰ نشتر ترکی کا ہے۔ سنجیدہ شاعری میں ان کے استاد قبلہ اعجاز صدیقی تھے اور زٹلیات میں مرحوم مائل ملیح آبادی سے مشورہ کرتے تھے۔ نشتر صاحب کی حمد و نعت کے طغرے ممبئی کی مساجد میں آویزاں ہیں۔ ان کے بچوں کے بچے مضافات میں کہیں رہتے ہیں۔ مجھے نشتر صاحب کے جنسی شعر کچھ یاد ہیں لیکن شائستگی کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنے اس سنجیدہ مضمون کو آلودہ نہ کروں۔

متقدمین شعرا کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے، نظام رام پوری کا ضرب المثل شعر ہے......

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

مرزا غالبؔ فرماتے ہیں......

دھول دھپہ اس بتِ طناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

جہاں استاد داغ کی شاعری میں زبان و بیان، فصاحت و بلاغت کا ایسا سرچشمہ ہے کہ ان کے معاصرین اور متقدمین میں سے بہت کم کسی کے یہاں ملے گا لیکن انہوں نے معاملہ بندی کی بھی شاعری کی۔

نہ ہم سمجھے، نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

داغ کے معاصرین میں امیر مینائی اہم استاد شاعر تھے۔ ان کا ایک ''داغ رنگ'' شعر آپ کو بھی یاد ہوگا۔

آنکھیں تو دکھاتے ہو، جوبن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

مشہور مزاح نگار شاعر شوکت تھانوی کا شعر ہے......

برقعے کے اندر کیا چیز وہ اللہ غنی ہے
برقعے سے جو باہر ہے وہ فقط مونگ پھلی ہے

اب کچھ اور شعر بھی ملاحظہ کیجئے......

سنجیدہ شاعر ڈرامہ و کالم نگار سلیم احمد مرحوم کا شعر ہے......

سمجھتا ہوں کہ شکایت ہے بہ زبانِ نو
ریل چلتی نہیں گر جاتا ہے پہلے سگنل

اردو کے مشہور و منفرد شاعر ظفر اقبال کے یہاں رطب ویابس بہت ساری شعری سماگری میں سے جنسی اشعار بھی منتخب کیے جاسکتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے......

نخرے سے کیا ترکِ سخن، خود بہ خود اس نے
ہاتھا پائی ہوئی یہاں تک تو

جدید شاعر ندا فاضلی کا 'عالم بھر' مشہور شعر ہے......

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

ایک شعر ایسا بھی ہے جس میں ذم کا پہلو نمایاں ہے۔ شاعر کا نام مجھے نہیں معلوم۔

دخترِ درزی کا سینہ دیکھ کر
جی میں آتا ہے کہ ململ دیجئے

راقم الحروف کی غزل کا ایک شعر ہے......

''بدن بھر'' انگڑائی میں کتنی شدت سموتی ہو
مرے اک جسم میں کتنی حدت سموتی ہو

'بدن بھر' جمالیات کا اظہار یہ ہر جسم کے پاس ہوتا ہے اور وہ اسے اپنے تجربوں، مشاہدوں سے گوندھ کر نام نہاد مرادانگی کے من گھڑت قصے جوڑ کر چٹخاروں کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

آخر میں ایک نازک ترین غزل ملاحظہ کیجئے۔اس کے قوافی جو پس منظر بتائیں گے، اسے ہر وہ شخص جو شادی شدہ ہے یا کنوارے پن میں لذت آشنا ہو چکا ہے وہ سمجھے گا کہ شب بیداری میں خواب گاہیں پوشیدہ ہیں۔غزل کا یہ کمال غزل ہی سے ممکن ہے۔

بدن بھر، مکالمہ، مت کرو، مرے جسم کے ساتھ
بدن بھر، موازنہ مت کرو، مرے جسم کے ساتھ
شکست ہوگی، بدن کو، غرور جاتا رہے گا پھر
بدن بھر، تقاضہ، مت کرو، مرے جسم کے ساتھ
نازکی، بکھر بکھر جائے گی، شب بھر میں
بدن بھر، مقابلہ، مت کرو، مرے جسم کے ساتھ
تمام حربے، مرے جسم کو بھی آتے ہیں سنو
بدن بھر، تماشہ، مت کرو، مرے جسم کے ساتھ
یہ میرا جسم امامی ہے لڑکیوں کی پسند
بدن بھر، مناظرہ مت کرو، مرے جسم کے ساتھ

شائستگی اجازت نہیں دیتی ورنہ تو بہت سارے شعر اپنے کمپیوٹر دماغ سے لکھا سکتا ہوں۔

لا حول ولا قوۃ اللہ باللہ
مغفرت مغفرت مغفرت

— افتخار امام صدیقی
یکم اپریل ۲۰۰۹
بروز بدھ دو بجے دن

OO

بدن کی جمالیات

(محبتوں اور ملامتوں کے درمیان)

۱۔ عشرت رومانی (پاکستان)

حقانی القاسمی کا مضمون 'بدن کی جمالیات' اپنی جگہ پر بہت منفرد ہے۔ انھوں نے جس طرح اور جس انداز سے اس موضوع کی شاعرانہ حد بندیاں کی ہیں اور تہذیبی سیاق وسباق میں اسے پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ذہنی جمالیات کا شاعرانہ ادراک حاصل ہے۔ جنسی جذبے اور تجربے بہر حال حقیقت ہیں جن سے مفر نہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ادبی حوالوں سے کس طرح ان کا اظہار کیا جائے۔

(سخنور کراچی، جولائی ۲۰۰۰ء)

۲۔ نظام صدیقی (الہ آباد)

'بدن کی جمالیات' اردو میں کنواری برف توڑنے کے مترادف ہے، تاہم بوڑھی دکھتی آنکھوں کو یہ خورشید نیمروزی مقالہ شاید برداشت نہ ہو۔ دراصل ہماری روحانیات، عشقیات اور جنسیات کی فوقی ترتیب کی روتشکیل کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہم ارفع جمالیات کے بیکراں اعظم تک رسائی حاصل کرسکیں۔

۳۔ حسین الحق (گیا)

'بدن کی جمالیات' پر حقانی القاسمی کی گفتگو غضب کی ہے۔

۴۔ اسلم حنیف (بدایوں)

'بدن کی جمالیات' کے دوران ایک دو مقام پر یہ احساس بھی اُبھرا کہ حقانی القاسمی نے طوالت کے خوف کی بنا پر قلم پر قابو رکھنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی خط وخال کے شعوری یالاشعوری اظہار کو فنون لطیفہ میں تلاش کرنے کے بعض حوالے نفسیاتی بحث کی اپیل کرتے ہیں لیکن یوں شعور کے پاکیزہ اظہارات پر جو خط تشکیک کھینچتا ہے اس سے مکمل اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مضمون بذات خود جامع اور خوب صورت ہے۔ مضمون کے مضمرات کو مزید مدلل بنانے کے لیے صاحب مقالہ کا مطالعہ اور انکشاف متاثر کرتا ہے۔

۵۔ ناصر شہزاد (پاکستان)

حقانی جی! آپ کا مضمون ''بدن کی جمالیات'' انتہائی خوبصورت مضمون ہے۔ آپ کی نذر یہ شعر......

زندگی جسم کی لذت کے سوا کچھ بھی نہیں
خون میں خون کی حدت کے سوا کچھ بھی نہیں

۶۔ ڈی۔ این۔ آریہ (الہ آباد)

حقانی القاسمی کا مضمون 'بدن کی جمالیات' بہت ہی بصیرت افروز اور جمالیاتی طور پر آسودگی بخش ہے۔ سنسکرت اور ہندی ادب میں تو اس پر بہت کچھ کھل کر لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے بدن کی جمالیات ایک اہم تخلیق ہے۔ یہ بہت بڑا فکریاتی انقلابی قدم ہے۔

۷۔ مشتاق احمد نوری (پٹنہ)

'بدن کی جمالیات' پر حقانی نے بہت محنت کی ہے حالانکہ حقانی سے ملنے کے بعد کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ بدن کی جمالیات کی اتنی باریکیوں سے واقف ہوں گے۔

سچ ہے واتسائن جیسے دینیات کے طالب علم کو دیکھ کر بھی کسی نے تھوڑے ہی سوچا ہوگا کہ وہ کام سوتر جیسی اہم کتاب لکھ پائیں گے۔ واتسائن کو تو ''صبح بنارس'' نے سب کچھ سکھا دیا، حقانی 'شام اودھ' دیکھ آئے ہیں کیا۔ ویسے حقانی نے عربی فارسی اور اردو شاعری کے ساتھ ناول اور ادب پاروں میں بدن کی جمالیات تلاش کرنے کے بعد یہ تو ثابت ہی کر دیا کہ '' کائنات کا سب سے بڑا محور بدن ہی ہے اور آج کی تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا، صارفیت زدہ سماج نے بدن کو سب سے بڑی طاقت کی حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے۔ اس کی گواہی آج کے اشتہارات دیتے ہیں۔ حقانی، الفاظ سے رنگوں کی طرح کھیلنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مضمون کے آخر میں لفظ 'نامکمل' دیکھ کر خوشی ہوئی، یہ امید بندھی کہ وہ اس مضمون کو ایک کتابی شکل میں مکمل کر کے ادب کے جمالیات کے خزانے کو بدن کی جمالیات سے بھی مالا مال کر دیں گے۔

۸۔ عشرت رومانی (پاکستان)

'بدن کی جمالیات' کے آٹھویں حصے میں جناب حقانی القاسمی نے ہونٹ کو تمہید وصل کہا ہے اور اسے اتصال، انضمام، ادغام اور اشتراک کی سب سے بڑی علامت بھی کہا ہے۔ انھوں نے اس کی بوندوں، جانفزا ساعتوں اور نیم شب کی دستکوں کے ذریعہ خوابوں کے چاند کٹوروں کو بھر دیا ہے۔ یہ سلسلہ جاری وساری ہے، حقانی صاحب نے جمالیات کے فلسفہ کو شاعرانہ حدبندیوں میں لاکر خواب ناک فضاؤں میں رنگ بکھیرے ہیں۔

۹۔ شمیم فاروقی (پٹنہ)

'بدن کی جمالیات' پڑھ کر سخت کوفت ہوئی۔ آپ کے نزدیک یہ سڑگل جانے والا بدن ہی سب کچھ ہے، یہی کائنات ہے، سنائی، عطار، عراقی، حافظ سبھی بدن کے اسیر ہیں۔ آپ نے بعض ایسے فحش جملے نقل کیے ہیں جنھیں دہراتے ہوئے شرم آتی ہے۔

حیرت وافسوس ہے کہ بدن کی جمالیات کی تلاش میں قرآن عظیم تک پہنچ گئے۔ آپ نے ''کواعب اترابا'' کا ذکر تو کر دیا مگر پوری آیت کریمہ نہیں لکھی کہ کس سیاق وسباق میں بات کہی گئی ہے۔ یہ تو ویسا ہی ہوا کہ آدمی لا الہ کہہ کر خاموش ہو جائے اور الا اللہ کو چھوڑ دے۔ آپ نے حافظ اور مولانا روم کے یہاں بھی بدن کی جمالیات تلاش کر لی۔ دیوان حافظ سے لوگ فال نکالا کرتے ہیں اور مولانا روم اقبال کے روحانی استاد تھے۔ حیرت ہے عارفانہ کلام میں بھی بدن کی جمالیات کا پہلو آپ نے نکال لیا۔ ٹھیک اسی طرح آپ نے حضرت امیر خسرو کا کلام بھی نقل کیا ہے۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

اوّل تو یہ ابھی تک متنازعہ فیہ ہے کہ یہ کلام خسرو کا ہے بھی یا نہیں۔ اگر ہے بھی تو یہ عارفانہ کلام ہے، اس میں بدن کی جمالیات کہاں؟ اگر ایسا ہی ہے تو حضرت امیر خسرو کے دیگر عارفانہ کلام کو آپ کیا نام دیں گے مثلاً......

چھاپ تلک سب چھینی موسے نیناں ملا کے......
موھے اپنے ہی رنگ میں رنگ دے رنگیلے......
کاہے کو بیاہی بدیس......
گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس......
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس......

اس طرح کے عارفانہ کلام میں جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے عشق میں کہے گئے، کیا بدن کی جمالیات کا پہلو نکلتا ہے؟

(مکتوب بنام حقانی القاسمی، مورخہ ۳۰/اپریل ۲۰۰۱ء)

۱۰۔ عشرت رومانی (پاکستان)

باب بدن میں حقانی القاسمی نے بدن کی وحدت کو بہت بڑی علامت کہا ہے

جس سے انسان نروان تک پہنچتا ہے۔اس مضمون میں انھوں نے تاریخی اور شعری حقائق کے امتزاج سے بدن کو محیط بے کراں بنا کر پیش کیا ہے جس میں بے شمار کہانیاں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں۔

(سخنور کراچی،نومبر ۲۰۰۰ء)

۱۱۔ نفیس بانوشمع (نئی دهلی)

'بدن کی جمالیات' پر حقانی القاسمی کی محنت بلاشبہ قابل تعریف ہے۔ وہ جمالیات کے سہارے بدن کی اتنی باریکیوں سے روشناس ہیں کہ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

۱۲۔ نظام صدیقی (اله آباد)

حقانی القاسمی کی ''رس شاستر'' سے روح کا مزہ بدل گیا۔ الفصوص میں ابن عربی نے فرمایا ہے......

''جب ہم اپنی زوجہ سے ہم بدن ہوتے ہیں تو درحقیقت خدا سے ہم روح ہوتے ہیں۔''

لیکن دوسری طرف یہ بھی سفاک حقیقت ہے کہ مادرانہ نظام کے خاتمہ کے بعد بھی عورت کو آرگزم نہیں ہوا ہے، یہی قدرتی اضطراب تانیثی تحریک کی جڑ ہے۔ ماسٹر اور جانسن کی کتاب سے ستر سال قبل معلوم ہوا کہ آرگزم بھی کوئی چیز ہے۔ اُوٹ پٹانگ آرٹیکل چھپتے رہتے ہیں۔ گیان سنگھ شاطر اس کا شکار ہو گیا ہے۔ آرگزم نہیں ہے۔ درحقیقت ویجنل آرگزم متھ ہے۔ کلائی ٹورل آرگزم میکنکل ہو گیا ہے۔ کلمک آرگزم سے لوگ واقف نہیں ہیں۔

۱۳۔ اقبال حسن آزاد (مونگیر)

بدن کی جمالیات پر حقانی القاسمی کا مضمون ایسا ہی کوئی افسانہ تخلیق کرنے پر اُکساتا ہے۔

۱۴۔ ڈاکٹر عبدالحق یوسف زئی (لندن) (۱)

حقانی القاسمی ''بدن کی جمالیات'' میں یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہیں کہ بدن، صاحب فکر فنکار کے لیے قابل قدر موضوع ہے۔ ان کے مضمون کو یہاں لندن میں احباب نے ایک خصوصی محفل میں بیٹھ کر پڑھا اور سنا اور ایک ایک جملے کا لطف لیا۔

۱۵۔ ڈاکٹر عبدالحق یوسف زئی (لندن) (۲)

میرے لندن کے احباب کا اصرار ہے میں جناب حقانی القاسمی کے بدن کی جمالیات کے بارے میں بھی چند سطریں لکھوں۔ اس بار موصوف نے اپناCue ''نمرتا'' سے لیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کے مضمون کے پہلے حصے میں، گیان سنگھ شاطر سے بھی ایک دوحوالے موجود تھے۔ اس بار تو انھوں نے ''نمرتا'' کا سمندر منتھن کر کے اس میں کچھ دُرِ نایاب کھنگالے ہیں۔ حقانی القاسمی فارسی اور عربی کے علاوہ کلاسیکل سنسکرت سے بھی آگاہ ہیں اور یہی وہ نگارخانہ ہے جس میں بدن کی جمالیات کی مختلف تصاویر ایک آرٹ میوزم کی طرح دیواروں پر آویزاں ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون کی اس قسط میں تو The Body beautiful کو اپنے فنِ اظہار سے zenith تک پہنچا دیا ہے۔

۱۶۔ شعیب شمس (موتیہاری)

حقانی القاسمی بدن کی جمالیات کی تخلیق میں نئی نئی حدیں تلاش کرتے جا رہے ہیں۔ اس بار ان کا صفحہ نمرتا کے بدن اور احساسات کی جمالیات میں کھو گیا ہے۔ مضمون کا مطالعہ کرنے کے وقت بار بار مجھے یہ احساس ہوا کہ جیسے میں تیسری بار نمرتا کا مطالعہ کر رہا ہوں، وہی انداز بیاں، ویسے ہی الفاظ تقریباً ویسے ہی خیالات۔ محترم حقانی کی بہت بڑی کامیابی یہ ہے کہ جس تخلیق کا تجزیہ کرتے ہیں اسی تخلیق کی زبان استعمال کرتے ہیں۔

۱۷۔ ڈاکٹر کیول دھیر (لدھیانہ)

'بدن کی جمالیات' جہاں نمرتا کا پریچے کراتی ہے، وہاں آپ کے گہرے مطالعے اور ذہانت کے دریچے بھی کھولتی ہے۔

۱۸۔ پروفیسر قیصر نجفی (پاکستان)

'باب بدن' حقانی القاسمی کے تبحر علمی، تعمق فکر و نظر اور انتقادی شعور کا ایک دستاویزی ثبوت ہے جس میں جمالیاتی نشاط کی تشریح و تعبیر انھوں نے جس چابک دستی سے کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔

(سخنور، کراچی)

۱۹۔ ڈاکٹر اسلم حنیف (بدایوں، یو.پی)

لگتا ہے حقانی القاسمی، قاسمی البدنیات کے نام سے موسوم ہو جائیں گے۔ بدن کی جمالیات پر یہ اچھوتا مضمون جس انداز سے آگے بڑھ رہا ہے اور ہر استعارہ کے شمارے میں تشنگی کا احساس چھوڑ جاتا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ مضمون نگار عملی تجربات سے نہیں گزرا ہے۔ جس دن زندگی میں بدن حائل ہو گیا دوئی کا احساس بڑھ جائے گا۔ تصور اور تخیل کی کائنات رنگارنگ زندگی کی تلخیوں سے منتشر ہو جائے گی (رب نہ کرے) پھر ردعمل ظاہر ہوگا۔ کرب وصال کی صورت میں اور یوں یہ کام ادھورا رہ جائے گا۔

۲۰۔ ظہیر آفاق (مدراس)

بدن کی جمالیات کے تعلق سے حقانی صاحب کے مشاہدہ سے میں سو فیصد متفق ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ بقول حقانی سب سے جمالیاتی نقوش و مظاہر افسانوں میں ملتے ہیں۔

۲۱۔ ناصر راہی (جمشید پور)

حقانی القاسمی کا معرکہ آرا کارنامہ، پہلی بار بدن کی جمالیات کو نثری آب میں معکوس کیا گیا ہے ورنہ قلی قطب شاہ، سودا، میر، غالب، داغ، مومن، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، مجاز لکھنوی، اعزاز افضل، افتخار امام صدیقی اور پروفیسر سید احمد شمیم کے علاوہ سیکڑوں شعرا نکل آئیں گے کہ جنھوں نے بدن کی جمالیات کو منظومات میں باندھا ہے۔ ادبی متن جسم ہے Exactily، اس رو سے قاسمی نے فکشن میں منٹو کی سوگندھی اور بیدی کی اندو کے بدن کی جمالیات کو اپنے قلم سے مس کیا ہے اور جمالیات کی ساخت میں کھجوراہو کے مندروں تک چلے گئے ہیں۔ یہ شعری سفر سواد جمالیات ہے۔

۲۲۔ شہاب صفدر (پاکستان)

حقانی القاسمی جس طرح بدن کی جمالیات پیش کر رہے ہیں مجھے تو شمارہ۔۱ اور شمارہ۔۲ کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔

۲۳۔ نظام صدیقی (الہ آباد)

حقانی القاسمی بڑے فارم میں ہیں۔ ''بدن کی جمالیات-۵'' یکسر 'جمالیاتی اوڈیسی' ہونے کے ساتھ مختلف نثری اسالیب کا ہوش ربا نگار خانہ رقصاں ہے، البتہ ''اوم منی پدمے'' کے ترجمہ میں ان سے سہو ہوگئی ہے۔ یہ تبتی منتر ہے۔ یہ وصال اکبر کا مخفی رمزیہ ہے۔

۲۴۔ عتیق احمد عتیق (مدیر توازن، مالیگاؤں)

بدن کی جمالیات کی قرأت کی ساعتوں میں سورہ رحمٰن کی وہ ساتوں آیتیں جو جمالیاتی عینان کے یاقوت و مرجان سے بھری پُری اور حور و مقصورات کی نسبت سے متکئین علی فرش بطائنها من استبرق اور علی رفرف خضر و عبقری حسان کی

وضاحتوں سے مختص ہیں، دل ودماغ میں گونجتی رہتی ہیں۔ جن پر ایمان وایقان کچھ اور بھی مستحکم ہوکر رہ گیا ہے۔ دراصل انداز بیان آپ کا بڑا محاکاتی اور طرز اظہار کا جمال وکمال اس پر مستزاد۔

۲۵۔ عشرت رومانی (پاکستان)

باب بدن حسب معمول حقانی القاسمی کی خوب صورت تحریر سے مزین ہے۔ جس میں بدن کی جمالیات پر شاعرانہ انداز میں تاریخی سماجی اور شعری حوالوں سے بہت ہی اہم نکات کے تناظر پیش کیے ہیں۔ انھوں نے فن (تخلیق) اور تنقید کو جمالیات کے تناظر میں پیش کرتے ہوئے بہت ہی خوب صورت اور معنی خیز بات کہی ہے ''تخلیق (فن) اور تنقید میں وہی رشتہ ہوتا ہے جو پاروتی اور شیو میں ہے جو عاشق و معشوق میں ہے جو شمع اور پروانے میں ہے۔''

۲۶۔ عرفان صدیقی (لکھنؤ)

آپ کا سلسلہ وار مضمون 'بدن کی جمالیات' دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں۔

(۲۸/اگست ۲۰۰۳ء)

۲۷۔ ساجد رشید (ممبئی)

جمالیات اور بالخصوص بدن کی جمالیات پر آپ نے غضب کا کام کیا ہے۔ یہ کتاب ضرور شائع ہونی چاہیے۔ یہ میری خواہش نہیں ادب کی ضرورت ہے۔

(۲۵/جولائی ۲۰۰۳ء)

۲۸۔ ظفر اقبال ظفؔر (فتح پور)

آپ کا مضمون ''بدن کی جمالیات'' پڑھا۔ بہت خوب صورت پیرایے میں آپ نے

مضمون قلم بند کیا ہے۔ زبان بھی بہت خوبصورت استعمال کی ہے۔ نثر میں شاعری کا لطف آ گیا۔ (یکم جولائی ۲۰۰۰ء)

۲۹۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید (حیدر آباد)

باب بدن کے تحت حقانی القاسمی نے بدن کی جمالیات کے تعلق سے مضامین کے سلسلہ کو جاری رکھا ہے...... یہ سلسلہ نہ صرف جاری رہنا چاہیے بلکہ اس کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

(روزنامہ ''سیاست''، حیدر آباد، ۱۵ر جولائی ۲۰۰۲ء)

۳۰۔ اظہار اثر (جاسوسی ناول نگار، نئی دھلی)

ایک بار میں نے اپنے ایک ناول میں جاسوس طارق کے اسسٹنٹ بہزاد سے کہلوایا تھا۔ ''کل میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ مجھے ''لڑکیبیا'' کا مرض ہوگیا ہے۔''

''وہ کیا ہوتا ہے—'' طارق نے سوال کیا۔

''اس مرض میں مریض کو ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آتی ہیں۔''

حقانی القاسمی بھی کسی ایسے ہی مرض کا شکار ہوکر آج کل بدن کی جمالیات میں ایسے الجھ گئے ہیں کہ انھیں عورت کے برہنہ بدن کے علاوہ کچھ نظر آنا بند ہوگیا ہے۔

اس بات کو آگے بڑھانے سے پہلے میں قاسمی صاحب سے چند سوال کرنا چاہوں گا۔ میرا پہلا سوال ہے!

کیا بدن کی جمالیات صرف عورت کی ذات تک محدود ہے جب کہ فطرت کی سچائی یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنے بھی جاندار ہیں ان میں ''نر'' ہمیشہ ''مادہ'' سے زیادہ خوبصورت پائے جاتے ہیں جس کی معمولی مثال مور، شیر، تیتر، بٹیر اور بے شمار پرندے اور جانور ہیں۔ جانوروں کی حیاتیات (Biology) سے تعلق رکھنے والے سائنسدانوں کا

متفقہ فیصلہ ہے کہ نر جانور مادہ سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے اور یہ بات صرف جانوروں تک محدود نہیں آپ ایک صحت مند مرد اور ایک صحت مند عورت کو برہنہ کھڑا کر کے دیکھئے کہ دونوں میں کس کا بدن جمالیات سے بھرپور ہے؟

میرا دوسرا سوال ہے!

کیا قاسمی صاحب کی جمالیات کا فارمولا دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل پر لاگو ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضمون میں جس طرح بدن کی جمالیات کی سحر طرازیاں پیش کرتے ہیں۔ کیا یہی فارمولا یا تعریف دنیا کے ہر حصہ کی عورتوں پر صادق اترتی ہے۔ مثلاً میں افریقہ کی نیگرو (حبشی) خواتین کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کے مرد موٹے ہونٹ، لمبے کان اور لمبی گردن کو حسن مانتے ہیں یا امریکی مرد خواتین کے جسموں سے زیادہ ان کی لمبی ٹانگوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں (اس سلسلہ میں ہالی ووڈ میں ایک فلم ''ڈیڈی لانگ لیگ'' (Dady long leg) بنائی گئی تھی۔ چینی مرد بادامی آنکھیں پسند کرتے ہیں جبکہ فارسی میں غزالی آنکھوں کو سراہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں سانولے رنگ، لمبے کالے بال اور میناکشی آنکھوں سے مرد شہید ہوتے ہیں۔

میرا تیسرا سوال ہندی لہجہ میں ذرا اُٹ پٹا سا ہے۔ اس سوال کے ذریعہ میں حقانی صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں!

''کیا بدن کی جمالیات کی کہیں کوئی حد ہے؟''

اس کائنات میں ہر چیز کی حد ہوتی ہے (سوائے کائنات کے) تو پھر جمالیات کی حد کہاں ہے یعنی اس کا کلائمکس یا انتہائی مرکز کہاں ہے؟

اور میرا چوتھا سوال ہے — ؟

''آج تک کسی نامرد (Hermaphrodite) نے عورت کے بدن کی جمالیات کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ کیا مخنث یعنی تیسری جنس کے انسان، انسانوں کی صف میں نہیں آتے؟ ان میں سوچنے کی قوت نہیں ہوتی؟ ان کی خواہشات نہیں ہوتیں؟ مجھے یقین ہے، قاسمی صاحب منطقی اور سائنسی اعتبار سے ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتے! اس

لیے میں خود ہی ان سوالوں کے جواب پیش کر رہا ہوں۔

عورت کے بدن کی جمالیات کی آخری حد، عورت کے بدن میں ''ناف'' سے نیچے ہوتی ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی جمالیات باقی رہتی ہے نہ حسن۔۔۔ شہوت سے بھرپور ایک نوجوان مرد، ایک عورت کا بدن دیکھ کر اس کو دنیا کی ہر حسین شے سے تشبیہ دے سکتا ہے۔ ہر اُس چیز سے اس کا تقابل کر سکتا ہے جس کو حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن ہو لیکن جب عورت کے بدن کا وہ مرکز اُسے حاصل ہو جاتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے وہ دیوانہ بن جاتا ہے تو بدن کی ساری جمالیات ایک رات میں ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ بدن ایک عام عورت کا بدن رہ جاتا ہے جس میں وہ تمام جمالیات دم توڑ دیتی ہیں جو اس بدن کو حاصل کرنے سے پہلے اس مرد کو نظر آتی تھیں۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر لذت آمیز چیز ایک مقدار تک لذت دیتی ہے۔ حد سے بڑھ جانے کے بعد کسی چیز میں لذت نہیں رہتی۔ فطرت کا اصول ہے جو چیز اپنی فطری حدود سے باہر نکل جاتی ہے وہ معکوس ہو جاتی ہے یعنی اس کی تاثیر اُلٹی ہو جاتی ہے۔

بدن کی جمالیات پر حقانی صاحب کی تحریریں ان کے ذہن کے Frustration کو ظاہر کرتی ہیں ورنہ ہر عورت کے بدن کی ساخت ایک جیسی ہوتی ہے۔

یہاں میں قاسمی صاحب کو ایک مشورہ دینا چاہوں گا! آج کل خواتین سیکس کے موضوع پر آزادانہ لکھ رہی ہیں۔ آپ کچھ خواتین کو دعوت کیوں نہیں دیتے کہ وہ مردوں کے بدن کی جمالیات پر کچھ لکھیں۔

بدن کی جمالیات پر اس وقت مجھے ہندو دیومالا کی ایک کہانی یاد آ گئی۔

اندر دیوتا کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ عورت کے بدن کی جمالیات کے رسیا تھے۔ ان کی سبھا کی اپسرائیں پوری کائنات سے چنی ہوئی خوبصورت عورتیں ہوتی تھیں۔ ایک بار اندر دیوتا نے گوتم نام کے ایک رشی کی بیوی اہلیا کو نہا دھو کر بال سکھاتے دیکھ لیا اور اس کے بدن کی جمالیات پر مرمٹے، وہ اہلیا کو حاصل کرنے کی

ترکیبیں سوچنے لگے۔ انھیں پتہ چلا کہ اہلیا کے پتی گوتم رشی صبح کو پو پھٹتے ہی گنگا کے پوتر جل سے اشنان کرنے چلے جاتے ہیں اور پھر سورج نکلنے تک وہیں گنگا کے کنارے بیٹھ کر پوجا کرتے رہتے ہیں۔ گوتم رشی کے اس روزانہ کے معمول کو جان کر اندر دیو کے ذہن میں اہلیا کو حاصل کرنے کی ایک ترکیب آگئی۔ وہ دیوتا چندر ما کے پاس پہنچے اور اس سے مدد مانگی۔ چندر ما نے کہا:

''اندر جی میں آپ کی مدد کس طرح کر سکتا ہوں؟''

اندر جی نے چندر ما کو گوتم رشی کا روزانہ کا معمول بتا کر کہا......

''تم ایک روز صبح کی پو پھٹنے سے پہلے ہی اپنی مکر چاندنی پھیلا دینا۔ گوتم رشی سمجھیں گے کہ صبح ہونے والی ہے، اس لیے وہ اشنان اور پوجا کرنے گنگا تٹ پر چلے جائیں گے چونکہ وہ اصل صبح نہیں ہوگی اور گوتم رشی سورج نکلنے تک پوجا کرتے رہیں گے اس لیے مجھے اہلیا کے پاس رہنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔'' چندر ما راضی ہو گیا۔ اس نے اپنی مکر چاندنی پھیلا دی جس سے گوتم رشی دھوکا کھا گئے۔ ان کے کٹیا سے جاتے ہی اندر دیوتا نے چندر ما سے کہا:

''میں کٹیا میں جاتا ہوں تم باہر رہ کر پہرہ دو— گوتم رشی آتے نظر آئیں تو مجھے خبردار کر دینا۔''

ادھر گوتم رشی اشنان کر کے پوجا کرنے بیٹھ گئے۔ وہ روزانہ پوجا کرتے تھے، اس لیے ان کو اندازہ تھا کہ سورج کتنی دیر بعد نکلتا ہے۔ اس روز وقت گزرتا گیا اور سورج نکلنے کے آثار نظر نہ آئے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ دوبارہ پو پھٹ رہی ہے۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ مکر چاندنی سے دھوکا کھا گئے۔ مگر وہ بھی رشی اور گیانی تھے اس لیے سمجھ گئے کہ کسی نے ان کے ساتھ چال چلی ہے۔ وہ اسی وقت اُٹھ کر واپس چل دیے۔ کٹیا پر پہنچے تو چندر ما کو دروازہ پر کھڑا دیکھا۔ وہ غصہ میں بھرے اندر داخل ہوئے اور اندر دیوتا کو اپنی پتنی کے ساتھ دیکھ لیا۔ گوتم رشی کو اس قدر غصہ آیا کہ انھوں نے پتنی کو اسی وقت شراپ (بددعا) دے کر پتھر بنا دیا (سیکڑوں سال بعد شری رام نے اس پتھر کو چھو کر اہلیا کو دوبارہ زندگی دی

تھی) اس کے بعد گوتم رشی نے اندر دیوتا سے کہا:

''اندر جی آپ دیوتا ہیں لیکن آپ بھی میرے شراپ سے بچ نہیں سکتے۔ آپ کو ''بھگ'' (عورت کی اندام نہانی) بہت پسند ہے، اس لیے میں شراپ دیتا ہوں کہ آپ کے سارے بدن پر بھگ ہی بھگ بن جائیں گے۔''

گوتم رشی کے شراپ سے اسی وقت اندر جی کے سارے بدن پر عورت کی اندام نہانیاں بن گئیں۔ اس کے بعد گوتم رشی باہر آ گئے اور اپنا بھیگا ہوا انگوچھا چاند کے منہ پر مار کر کہا۔

تو اس پاپ کا حصہ دار ہے، جا...... میں شراپ دیتا ہوں کہ تیرے منہ پر جہاں جہاں انگوچھا رکھا ہے وہاں کالے داغ بن جائیں جو ہمیشہ رہیں گے۔''

اندر دیوتا اپنے جسم پر عورت کے پوشیدہ مقام دیکھ کر گھبرا گئے اور بہت سے دیوتاؤں کے پاس جا کر مدد مانگی کہ وہ گوتم رشی کو اپنا شراپ واپس لینے پر راضی کر دیں۔ بہت سے دیوتا مل کر گوتم کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنا شراپ واپس لے لیں۔ گوتم رشی نے جواب دیا کہ وہ اپنا شراپ واپس نہیں لے سکتے لیکن چونکہ آپ لوگ میرے پاس آئے ہیں اس لیے میں یہ کر سکتا ہوں کہ اندر دیوتا کے جسم پر جتنے بھی بھگ کے نشان ہیں وہ سب آنکھیں بن جائیں کیونکہ ''بھگ'' (اندام نہانی) آنکھ کی شکل کی ہوتی ہے۔ ان کے یہ کہتے ہی اندر دیوتا کے جسم پر بنی اندام نہانیاں آنکھیں بن گئیں، اسی لیے اندر دیوتا کو ہزار آکشی یعنی ہزار آنکھوں والا بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قاسمی صاحب کو مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے خیالات اور اپنے قلم کو ذرا قابو میں رکھیں۔ وہ متقی آدمی نہیں، کہیں اندر دیوتا جیسی مشکل میں نہ پھنس جائیں۔ ویسے بھی قاسمی صاحب کو یہ ضرور علم ہوگا کہ ''یونی'' جسے بھگ یا اندام نہانی بھی کہا جاتا ہے، ہر یگ میں، ہر جیون کو جنم دینے والی رہی ہے۔ اسی سے یہ ساری جمالیات پیدا یا شروع ہوئی ہے اور اسی پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔

۳۱۔ مولوی مظہری

حقانی کے اعصاب پر عورت اور Sex میں گندھا ہوا اس کا سراپا مسلط ہے۔ بدن سے اس کی نظر میں صرف نوجوان عورت کا خوبصورت اور شہوت انگیز بدن مراد ہے۔ پھر عورت جس کے مختلف روپ ہیں وہ ماں بھی ہے، بہن بھی اور بیٹی بھی۔ ایک نو عمر بچے کی نظر میں ماں کا بدن جمال اور کشش کے انگنت پہلو رکھتا ہے۔ لیکن ہمارا مضمون نگار عورت کو صرف ایک زاویے سے دیکھتا ہے: سیکس کی دیوی، جنسی اشتہا کا منبع، حیوانی اور مادی خواہشات کی آسودگی وسیرابی کا ذریعہ۔

انسان کی تخریبی جبلت کے ''شاہکار'' اس مضمون میں نسوانی بدن کے بخیوں کو ادھیڑ کر اور عریانی وبے حجابی کے متعدد نمونوں کو ٹانک ٹانک کر قصداً ایسی فضا تشکیل دینے کی کوشش کی گئی کہ محسوس ہوتا ہے جیسے "A"/"B"(Blue) مارکہ فلم کی کیسٹ چل رہی ہو۔

ملاحظہ فرمائیں کہ ڈیڑھ ہزار سال سے زائد عرصے پر محیط عربی شاعری سے صاحبِ مضمون نے جس شعر کا انتخاب کیا ہے وہ غالباً پوری عربی شاعری کا فحش ترین اور گندا شعر ہے (ص: ۱۲۸) امراء القیس کے نہاتی لڑکیوں کے کپڑے چھپا لینے اور برہنہ جسموں کو دیکھنے کی شرط پر انھیں لوٹانے کا واقعہ، جو اخلاق باختگی، بے حیائی اور بے غیرتی کی ایک نمایاں مثال ہے۔ (ص: ۱۲۸) ہمارے مضمون نگار کو اس میں بھی کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ اس واقعے کو بھی وہ ''بدن کے جمالیاتی اظہار اور مشاہدے'' کی شکل میں دیکھتا ہے۔ عربی شاعر ابونو اس مضمون نگار کو بطورِ خاص پسند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شاعری میں وہ ساری چیزیں بہ تمام وکمال مل جاتی ہیں جو مضمون نگار کے ذہنی رجحانات کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں۔ جام وپیمانے کے ساتھ امرد پرستی اور ہم جنسی کا بیباکانہ اظہار اس کی شاعری کی پہچان ہے۔ شاعری کی اسی صفت کے حوالے سے مضمون نگار پہلے بھی شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کر چکے ہیں (جس پر علمی حلقوں میں کافی شور ہنگامہ ہوا تھا)۔ اس اہم مضمون میں ایسے شاعر کو فراموش کر دینا بھلا کیوں کر ممکن تھا۔ چنانچہ نو

عمر لڑکوں کے اعضائے جسمانی کی جنسی تعبیر و تشریح کے ساتھ (جو اس لائق ہر گز نہیں ہے کہ اسے سپرد قرطاس کیا جا سکے) اسی حوالے سے وہ اس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہیں، اور اسے ''Homo-eroticism کی اعلیٰ مثال'' قرار دیتے ہیں۔ (ص: ۱۲۸)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایروٹک یا ہومو ایروٹک شاعری، شاعری کی کون سی صنف ہے۔ اگر بات یہی ٹھہری تو نوچیوں، طوائفوں، کھسرے رقاصاؤں بلکہ مغرب میں بننے والی بلو فلموں کی زبان کو بھی ایروٹک یا ہومو ایروٹک نثر (یا نثری نظم) کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں......

> واتسائن کے کام سوتر کو اس کی مکمل معنویت اور تہذیبی سیاق و سباق کے ساتھ Recreate کرنے والے شاعر صلاح الدین پرویز نے Eroticism کی اس روایت کو اردو شاعری میں بحال کیا ہے۔ جس کی بنیاد واتسائن نے ڈالی تھی، اس طرح انھوں نے مضمون نگار کے بقول: ''کام سوتر'' کا شعری کاؤنٹر پارٹ لکھ کر یہ احساس دلایا کہ ایروٹسزم بدن سے نکل کر آتما کی اشتہا بجھانے کا نام ہے (ص: ۱۳۲) نیز یہ کہ ''اس طرح صلاح الدین پرویز نے اپنی ایروٹک شاعری میں تقدیس کی چمک پیدا کی ہے۔
> (ص: ۱۳۴)

مذکورہ بالا اقتباس سے صلاح الدین پرویز کی شاعری کی ایک نئی جہت سامنے آئی ہے، اور وہ ہے ''کام سوتر شاعری یا ایروٹک شاعری'' جس کی روایت کو اردو میں بحال کرنے کا سہرا بھی مضمون نگار کے بقول صلاح الدین پرویز صاحب کے سر ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو بلا شبہ پرویز صاحب کا اس میدان میں کوئی ثانی نہیں۔ میر و غالب بھی ان سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

امراءالقیس سے صلاح الدین پرویز تک اس قسم کی شاعری (یا دیگر ''فن پارے'') بدن اور اس کی جمالیت کا نہیں، بلا واسطہ طور پر سیکس اور جنسیات کا اظہاریہ ہیں۔ ان کی اسی حیثیت سے شناخت ہوتی ہے، اور ہونی چاہیے۔ انہیں فن یا ادب کے

ضمن میں رکھنا ان کے ساتھ سراسر ظلم اور کھلواڑ ہے۔

لیکن اگر وہ اس پر مصر ہیں تو انہیں آگے بڑھ کر یہ بھی کرنا چاہیے کہ وہ اسے چھپوا کر ریڈ لائٹ ایریا میں تقسیم کروا دیں۔ یہ ان ''بالانشیں'' بدن کی دیویوں کی بڑی خدمت ہوگی۔ اس سے ان کی شامیں حسین اور راتیں مزید رنگین ہو جایا کریں گی۔

مضمون نگار کی یہ منطق بھی قطعاً سمجھ سے باہر ہے کہ اگر کسی دوشیزہ کے جسمانی خطوط اور اعضائے جنسی کی گنبد و مینار جیسی ''مقدس'' چیزوں کے ساتھ تشبیہ اور حوالے سے تصویر کشی کی جائے تو اس میں تقدس پیدا ہو جاتا ہے۔ (ص: ۱۴۳) اگر یہ حقیقت ہے تو پھر عورت کے ایک ایک عضو کو مندر و مسجد اور کلیسا کے منبر و محراب اور حوض و مینار کے ساتھ پینٹ کیا جا سکتا ہے لیکن کیا وہ جنسی رنگ سے پاک ہوگا، اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہوگی۔ مضمون نگار لکھتے ہیں: ''یہاں اس حقیقت کا ادراک بہت ضروری ہے کہ مساجد، منادر، گرجا گھر یہ سب ہمارے جسمانی مظاہر ہیں۔ ان کی شکلیں انسانی اعضا سے ملتی جلتی ہیں'' (ص: ۱۴۴) مسجد، مندر، گرجا گھر جیسے عبادت اور روحانیت کے مراکز بھی بدن کے جمالیاتی فلسفے کے تحت جسمانی مظاہر ٹھہریں، اس سے بڑا لطیفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بے معنی اور بچکانہ بات صرف اس لیے لکھی گئی ہے کہ صلاح الدین پرویز کی بدن کی شاعری کا جواز پیش کیا جا سکے۔

جنس اور آوارگی کے وہ تمام مظاہر، طریقے، اشکال و عبارات اور تعبیرات ورجحانات جو منحرف اور مسخ فطرت رکھنے والے افراد کے ذریعے انسانی تاریخ میں وجود میں آئے ہیں یا آرہے ہیں، مضمون نگار کو ان میں تقدیس کی چمک نظر آتی ہے۔ اس تقدس کے تصور میں انھوں نے جنت کی حوروں کے تصور کو بھی شامل کر لیا ہے کہ گویا وہ بھی بدن اور جنس ہی کا ایک استعارہ یا علامت ہیں۔ (ص: ۱۲۷)

کھجوراہو کے مجسمے، جن میں برہنہ مباشرتی افعال کی تجسیم کی گئی ہے، اور کام سوتر جیسی ''جنسیات کی بوطیقا'' (جس میں جنسیات کے تمام گر درج ہیں) کے ذکر کردہ

آسنوں کو مکمل تصویری خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے مضمون نگار کی نظر میں وہ تقدس کا احساس جگاتے ہیں۔ (ص: ۱۲۷) ایم۔ ایف۔ حسین کو مادھوری کے کولہوں کی جنبش میں تقدس نظر آتا ہے۔ ایم۔ ٹی۔ وی اور وی۔ چینل کے عریاں پروگراموں سے متعلق بھی وہ مثبت نظریہ رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ بھی بدن کی جمالیات کے کشف واظہار کا انتہائی اہم وسیلہ ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ پربھوداس گپتا کی پورنوگرافی پر مبنی کتاب '' The women جس میں عورت کے شہوت انگیز عریاں جسم کو پینٹ کیا گیا ہے۔ جس پر کافی ہنگامہ ہو چکا ہے، اور جسے ایک شریف اور صحیح الفطرت آدمی کن انکھیوں سے بھی دیکھنا گوارہ نہیں کرے گا۔ جو اخلاق باختگی اور بہیمانہ طبیعت کا مرقع ہے، مضمون نگار کی نظر میں وہ (ان کے بقول)......

''بدن کی جمالیات کی فوٹو گرافک تعبیر وتشریح اور جمالیاتی احساسات کا خوبصورت مرقع ہے۔'' (ص: ۱۳۶)

اتنا ہی نہیں وہ اس عریانیت پسندی کی مذکورہ کتاب کے مصنف کے لفظوں میں یوں توجیہہ کرتے ہیں کہ......

''سیکس اور Nudity کا ہماری روحانیت سے گہرا رشتہ ہے۔ (ص: ۱۲۷)

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔

جنس کے ساتھ تقدس اور روحانیت کی تکرار رجنیش ازم کے فلسفے کی مکمل بازگشت محسوس ہوتی ہے۔ اوشو رجنیش کا مذہبی موٹو (Motto) بھی یہی تھا۔ ''سمبھوگ سے سمادھی تک'' جنس پرستی کا یہ وہ فلسفہ ہے جسے امریکی قوم بھی برداشت نہ کر سکی، اور بالآخر وہاں سے بھگوان رجنیش کو اپنی امت کے ساتھ نکلنا پڑا۔ بہر حال! یہ بات عجیب لگتی ہے لیکن مضمون سے ایک قاری یہی تأثر لیتا ہے کہ صاحبِ مضمون فری ازم (اباحیت پسندی) میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں بے حیائی، بے شرمی اور عریانیت وفحاشی کا سرے سے کوئی وجود نہیں ہے۔

۳۱۔ انیس امروھوی (مدیر "قصے"، نئی دھلی)

حقانی القاسمی کے ''بدن کی جمالیات'' سیریز کے یہ مضامین اُردو ادب میں ایک نئی جہت کو تلاش کرنے کی کوشش ہیں۔ اس موضوع کو عالمی ادب کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ دُنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادب میں اس موضوع پر مختلف اصناف میں تخلیقات موجود ہیں۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں مراد آباد کے ایک کالج کی عمارت کی پیشانی پر لکھا ہوا جملہ پڑھا تھا جو مجھے اکثر یاد آتا ہے......

"Man is the nobelest work of GOD."

(انسان خدا کی بنائی ہوئی تمام مخلوقات میں شاہکار تخلیق ہیں)

خدا نے کل کائنات میں جتنی بھی مخلوق پیدا فرمائی ہے، اُن میں انسان کو بہترین شکل وصورت عطا فرمائی ہے، اور پھر عورت کے خدوخال میں خاص دلکشی اس لیے بھی رکھی گئی ہے کہ جب حضرت آدمؑ کا دل جنت جیسی جگہ میں بھی نہیں لگ رہا تھا تب ان کی دلبستگی کے لیے عورت کو پیدا کیا گیا۔ لہٰذا بالغ ذہنوں کے لیے بدن کی جمالیات پر سیر حاصل گفتگو کرنا یا اس عنوان کو زیرِ بحث لانا میرے خیال میں کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ ہاں، میں حسن اور عریانی کے فرق کو محسوس کرنے کے لیے ایک واقعہ کا ذکر کرنا یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔

ایک زمانے میں روم میں تصویروں کی ایک نمائش ہوئی تھی، جس میں دُنیا بھر کے بہت شہرت یافتہ مصور جمع ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہاں مظاہرہ صرف عریانی کا تھا، یعنی بے لباس حسن، جو کہ خالص آرٹ ہے۔ اس نمائش میں ایک مصور کی بنائی ہوئی ایک تصویر ایسی بھی تھی جو پورا لباس پہنے ہوئے تھی، لیکن ایک جگہ سے لباس کی ایک دھجی کو مصور نے نکال دیا تھا جو صرف تھوڑی سی تھی۔ لہٰذا اس تصویر کو نمائش سے باہر نکال دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ تصویر عریاں ہے، کیونکہ اس لباس کی دھجی کے نکال دینے سے اُس مصور کی نیت کو محسوس کیا جارہا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنا آرٹ نہیں دکھا رہا، بلکہ لوگوں کی توجہ ایک مخصوص غلاضت کی طرف منتقل کر رہا ہے۔

اس واقعہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فحاشی، عریانیت اور حسن میں بہت باریک سے ہی فرق ہیں۔ لہٰذا حسن اور عریانی کا تجزیہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ دنیا کے تمام تر خوبصورت فن پارے جو آرٹ کے شاہکار کہے جاتے ہیں، سب عریاں ہی ہیں۔ یہاں مجھے جاں نثار اختر کا ایک شعر یاد آرہا ہے......

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی
ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لیے ہے

اب جبکہ یہ مضامین کتابی شکل میں یکجا شائع کیے جا رہے ہیں، تو میرا خیال ہے کہ ان کو جنسی تلذذ کے لیے نہ پڑھ کر غور و فکر کے ساتھ عالمی ادب کے ایک موضوع کے طور پر ان کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ (یکم اپریل ۲۰۱۰، نئی دہلی۔)

OO

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	پھول جیسے لوگ (ناول)	انور خان	120.00
۲۔	یاد بسیرے (افسانے)	انور خان	80.00
۳۔	لمحوں کی قید (افسانے)	کشور سلطانہ	40.00
۴۔	انتخاب افسانہ ۸۹ء (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	60.00
۵۔	موج سحر (شاعری)	ڈاکٹر انجنا سندھیر	40.00
۶۔	قند و زقند (طنز و مزاح / نیا ایڈیشن)	فیاض احمد فیضی	150.00
۷۔	برزخ (افسانے)	ہاجرہ شکور	40.00
۸۔	فرات (ناول)	حسین الحق	100.00
۹۔	نیلام گھر (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
۱۰۔	کیا مذاق ہے (مزاحیہ شاعری)	اسمٰعیل آذر	80.00
۱۱۔	گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے)	علی امام نقوی	50.00
۱۲۔	بھوکا ایتھوپیا (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	110.00
۱۳۔	کانچ کی چادر (شاعری)	مریم غزالہ	40.00
۱۴۔	رنگین پرواز (اردو/ہندی شاعری)	پی۔این۔رنگین	80.00
۱۵۔	اردو تنقید حالی سے کلیم تک (تحقیق)	سید محمد نواب کریم	200.00
۱۶۔	دل کی بات (افسانے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	60.00
۱۷۔	کاغذی دیوار (افسانے)	محافظ حیدر	60.00
۱۸۔	رت جگے (شاعری)	رحمت امروہوی	60.00
۱۹۔	ادھار کی زندگی (افسانے)	مہر چند کوشک	60.00
۲۰۔	اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ (تنقید)	ڈاکٹر محبوب اعلیٰ قریشی	125.00
۲۱۔	پیاسا سمندر (افسانے)	عقیلہ تبسم	60.00
۲۲۔	ڈار سے بچھڑے (افسانے)	سید محمد اشرف	100.00
۲۳۔	غالبیات اور ہم (تحقیق)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	50.00
۲۴۔	آخری داستان گو (ناول)	مظہر الزماں خاں	60.00
۲۵۔	رشید احمد صدیقی کے اُسلوب کا تجزیاتی مطالعہ (تنقید)	خواجہ محمد اکرام الدین	60.00
۲۶۔	دُخترِ ابلیس (افسانے)	محمد شبیر علی محمودی	60.00
۲۷۔	حکیم کلب علی شاہد: شخصیت اور فن (مقالے)	خورشید مصطفیٰ رضوی	60.00
۲۸۔	ساغر نظامی: حیات اور ادبی خدمات (تحقیق)	ڈاکٹر سلمیٰ شاہین	100.00

۲۹۔	ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے (سفرنامہ)	پروفیسر علیم اللہ حالی	50.00
۳۰۔	مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار (تحقیق)	ڈاکٹر توحید خاں	80.00
۳۱۔	لیکن جزیرہ نہیں (افسانے)	تبسم فاطمہ	60.00
۳۲۔	سخنورانِ شاہجہاں پور (تذکرہ)	مبارک شمیم	150.00
۳۳۔	راہ میں اجل ہے (افسانے)	زاہدہ حنا	100.00
۳۴۔	اپٹا اور اردو ڈراما (تحقیق)	شاہد رزمی	60.00
۳۵۔	روتا ہوا آدمی (افسانے)	رئیس نجمی امروہوی	80.00
۳۶۔	مطالعہ مثنویات مصحفی (تنقید)	ڈاکٹر سعیدہ وارثی	100.00
۳۷۔	فلسطین کے چار ممتاز شعراء (تنقید)	عبدالحق حقانی القاسمی	60.00
۳۸۔	کنیادان (ڈرامے)	وجے تنڈلکر (اردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق)	80.00
۳۹۔	شہر چپ ہے (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
۴۰۔	بیان (ناول)	مشرف عالم ذوقی	100.00
۴۱۔	منڈیر پر بیٹھا پرندہ (افسانے)	احمد صغیر	60.00
۴۲۔	بے زبانی کا ہنر (شاعری)	ڈاکٹر سجاد سید	60.00
۴۳۔	حجاب امتیاز علی: حیات اور ادبی کارنامے (شخصیت)	مجیب احمد خاں	80.00
۴۴۔	اسرارِ غالب (تنقید)	سید قدرت نقوی	60.00
۴۵۔	اردو فکشن کی تنقید (تنقید)	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	250.00
۴۶۔	تذکرۂ خطیر (تحقیق)	تاباں نقوی امروہوی	50.00
۴۷۔	بالمشافہ (انٹرویوز)	معصوم مرادآبادی	80.00
۴۸۔	حریمِ شوق (شاعری)	نازش سہرامی/مرتب: زین رامش	60.00
۴۹۔	سنگ اُٹھانے کا حوصلہ (افسانے)	رضاء الجبار	80.00
۵۰۔	مظہر امام کی تنقید نگاری (تنقید)	محمد رضا کاظمی	50.00
۵۱۔	پوسٹر (افسانے)	قاسم خورشید	60.00
۵۲۔	شاخیں (مضامین)	ڈاکٹر علیم اللہ حالی	60.00
۵۳۔	جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	90.00
۵۴۔	ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفرنامہ)	ڈاکٹر قمر رئیس	100.00
۵۵۔	کن فیکون (افسانے)	رضوان احمد	90.00
۵۶۔	ادب میں گھوسٹ ازم (طنز و مزاح)	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	80.00
۵۷۔	سلسلے (شاعری)	مدہوش بلگرامی	60.00
۵۸۔	اجنبی ساعتوں کے درمیان (شاعری)	نعمان شوق	60.00

۵۹۔	ایک جام اور..... (شاعری)	فرحت قادری	60.00
۶۰۔	سوادِ جاں (شاعری)	مبارک شمیم	60.00
۶۱۔	رابطہ (تنقید)	جوگندر پال	90.00
۶۲۔	جمیل مظہری: بحیثیت نثر نگار (تنقید)	ڈاکٹر نعمت اللہ	80.00
۶۳۔	جدید ہندی شاعری (تنقید)	خورشید اکرم	80.00
۶۴۔	ایک غیر مشروط معافی نامہ (افسانے)	خورشید اکرم	60.00
۶۵۔	منڈی (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	100.00
۶۶۔	نہروں کا جال (شاعری)	خالد عبادی	60.00
۶۷۔	سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ (افسانے)	حسین الحق	80.00
۶۸۔	تکمیل (شاعری)	من موہن تلخ	80.00
۶۹۔	قمر رئیس: ایک زندگی (شخصیت)	مرتب: ڈاکٹر سلمٰی شاہین	250.00
۷۰۔	بے اصطلاح (مضامین)	جوگندر پال	90.00
۷۱۔	ٹھہرے ہوئے لوگ (افسانے)	انجم عثمانی	80.00
۷۲۔	اردو افسانے کا پس منظر (تنقید)	فیاض رفعت	60.00
۷۳۔	دستک (شاعری)	اختر شاہجہاں پوری	80.00
۷۴۔	بے ارادہ (افسانے)	رفیع حیدر انجم	80.00
۷۵۔	ادب کی تفہیم (تنقید)	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی	80.00
۷۶۔	آئینے کی گرد (افسانے)	شکیل جاوید	80.00
۷۷۔	ہندوستان میں جنگ جمہوریت (سوانح)	جگت رام ساہنی	90.00
۷۸۔	سب رس: جدید اردو میں (تنقید)	قاضی انیس الحق	200.00
۷۹۔	ونس کا پھول (افسانے)	سہیل اعجاز صدیقی	90.00
۸۰۔	موسم عذابوں کا (افسانے)	علی امام نقوی	80.00
۸۱۔	غلام بخش اور دیگر کہانیاں (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	120.00
۸۲۔	وہ دن (افسانے)	غیاث الرحمٰن	80.00
۸۳۔	مراثیٔ شاد کا فکری پہلو (تنقید)	پروفیسر اظہار احمد	100.00
۸۴۔	شام اودھ (ڈرامے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	100.00
۸۵۔	اردو کے نثری اسالیب (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	150.00
۸۶۔	کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ (تنقید)	ڈاکٹر ابرار رحمانی	200.00
۸۷۔	جھلستے جنگل (ناول)	انور عظیم	100.00
۸۸۔	اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات (تنقید)	ڈاکٹر شہناز شاہین	160.00

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۸۹۔	میری کہانی (سوانح)	اویس احمد دوراں	120.00
۹۰۔	دس دن (ناول)	ڈروا سا	90.00
۹۱۔	پرندے (افسانچے)	جوگندر پال	110.00
۹۲۔	ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے)	مجتبیٰ حسین	100.00
۹۳۔	مثنوی مناقب خواجہ (شاعری)	محمد علی موج رام پوری	40.00
۹۴۔	معاصر اسلامی تحریکات اور فکرِ اقبال (تنقید)	ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	150.00
۹۵۔	آخر کب تک (ناول)	اقبال نظامی	120.00
۹۶۔	ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید (تنقید)	احمد سہیل	200.00
۹۷۔	ذبح (ناول)	مشرف عالم ذوقی	100.00
۹۸۔	زندہ اپنی باتوں میں: بیدی، عصمت اور عباس (انٹرویوز)	فیاض رفعت	100.00
۹۹۔	مضامینِ نو (مضامین)	نرگس سلطانہ	100.00
۱۰۰۔	اردو میں قصیدہ نگاری (تنقید)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	150.00
۱۰۱۔	لابوہیم (افسانے)	انور عظیم	150.00
۱۰۲۔	بساط (ناول)	علی امام نقوی	100.00
۱۰۳۔	مٹی کے حرم (ناول)	ساجدہ زیدی	250.00
۱۰۴۔	کلیاتِ کیف (شاعری)	کیف گنگوہی	150.00
۱۰۵۔	مکالمہ (آجکل کے اداریے)	محبوب الرحمٰن فاروقی	200.00
۱۰۶۔	اردو شاعری کے روشن چراغ (تذکرہ)	طارق متین باغپتی	100.00
۱۰۷۔	آدھی رات کی شبنم (شاعری)	مرغوب علی	100.00
۱۰۸۔	مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک (تحقیق)	ڈاکٹر محمد کاظم	100.00
۱۰۹۔	صوبہ سرحد میں جنگِ آزادی (سوانح)	جگت رام ساہنی	100.00
۱۱۰۔	اصطلاحاتِ نفسیات: تشریح و تفہیم	سیّد اقبال امروہوی	250.00
۱۱۱۔	کارواں گزر گیا (افسانے)	ایم۔ اینچ۔ خان	150.00
۱۱۲۔	حاضر حال جاری (افسانے)	سریندر پرکاش	250.00
۱۱۳۔	واپسی سے پہلے (افسانے)	صغیر رحمانی	150.00
۱۱۴۔	نادید (ناول)	جوگندر پال	150.00
۱۱۵۔	ہرچرن چاؤلہ: فن اور شخصیت (مضامین)	مرتب: ڈاکٹر نگار عظیم	150.00
۱۱۶۔	اور اک فن (تذکرہ)	اختر شاہجہانپوری	150.00
۱۱۷۔	گمشدہ آدمی (افسانے)	نسیمن احمد	150.00
۱۱۸۔	جدید نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سیّد اقبال امروہوی	150.00

۱۱۹۔	غمِ دل وحشتِ دل (ناول)	ڈاکٹر محمد حسن	250.00
۱۲۰۔	بلونت سنگھ: فن اور شخصیت (تحقیق)	ڈاکٹر ممتاز آراء	200.00
۱۲۱۔	بھگت سنگھ کی واپسی (ڈرامے)	ساگر سرحدی	150.00
۱۲۲۔	مسیحا کی موت (افسانے)	قاضی انیس الحق	200.00
۱۲۳۔	شہرِ نگاراں (ناول)	رفعت سروش	200.00
۱۲۴۔	رسالہ "جامعہ" کا تنقیدی مطالعہ (تحقیق)	ڈاکٹر فرزانہ خلیل	300.00
۱۲۵۔	فراق: مطالعہ، محاسبہ (تنقید)	مرتب: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	120.00
۱۲۶۔	فساد (ناول)	مہرالدین خاں	100.00
۱۲۷۔	گلدستۂ بیت بازی (شاعری)	مرتب: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	200.00
۱۲۸۔	انتخاب کلیات ن۔م۔ راشد (شاعری)	مرتب: مرغوب علی	180.00
۱۲۹۔	تنقیحات (تنقیدی مضامین)	ڈاکٹر نیر جہاں	120.00
۱۳۰۔	مضامین ہفت رنگ (تنقیدی مضامین)	محبوب الرحمٰن فاروقی	200.00
۱۳۱۔	جوگندر پال کی کہانیاں (افسانے)	جوگندر پال	180.00
۱۳۲۔	جوش ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ	مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس	200.00
۱۳۳۔	تپش (افسانے)	ولی محمد چودھری	150.00
۱۳۴۔	نثری بیانیہ (تنقید)	ڈاکٹر مجید بیدار	150.00
۱۳۵۔	دردکا رشتہ (افسانے وناولٹ)	راشد سہسوانی	200.00
۱۳۶۔	وقار الملک: فخر امروہہ (شخصیت)	مرتب: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	200.00
۱۳۷۔	پرائی چیز (بچوں کی کہانیاں)	شکیل جاوید	120.00
۱۳۸۔	گزرگاہِ خیال (مضامین)	پروفیسر ساجدہ زیدی	200.00
۱۳۹۔	متاعِ شاد (شاعری)	منشی بشن دیال شاد دہلوی	100.00
۱۴۰۔	رودادِ انجمن (رپوتاژ)	حمید اختر	200.00
۱۴۱۔	عورت: زندگی کا زنداں (مضامین)	زاہدہ حنا	250.00
۱۴۲۔	اُردو ناول کے اسالیب (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	250.00
۱۴۳۔	سائبان (شاعری)	اختر شاہجہاں پوری	150.00
۱۴۴۔	تلاش وتعمیر (اختر شاہجہاں پوری کے فن پر مضامین)	مرتب: مدہوش بلگرامی	180.00
۱۴۵۔	ایک کتاب اور...... (طنز ومزاح)	یوسف ناظم	150.00
۱۴۶۔	روز مرّہ کی نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سید اقبال امروہوی	180.00
۱۴۷۔	مولانا شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر نیر جہاں	250.00
۱۴۸۔	نقدِ نگاہ (تنقید)	لطف الرحمٰن	200.00

۱۴۹۔ قمر رئیس: ادبی و علمی شناخت (شخصیت)	مرتب: خوشنودہ نیلوفر	200.00
۱۵۰۔ پریم چند: نئے تناظر میں (تنقید)	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	200.00
۱۵۱۔ عورت اور سماج (تنقید)	ڈاکٹر محمد شہزاد شمس	140.00
۱۵۲۔ جان پہچان (انٹرویوز)	رئیس صدیقی	100.00
۱۵۳۔ خواب نگر (شاعری)	ڈاکٹر محمد حسن	120.00
۱۵۴۔ ہندستان کا سرخ سفر (سیاسی تاریخ)	نریش ندیم	300.00
۱۵۵۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا (فلمی شخصیات)	انیس امروہوی	280.00
۱۵۶۔ قحط اور بارشیں (شاعری)	جلیس نجیب آبادی	120.00
۱۵۷۔ خیال کی مسافت (مضامین)	شمیم حنفی	300.00
۱۵۸۔ سفر کہانی (پاکستانی سفرنامہ)	مرغوب علی	120.00
۱۵۹۔ ناکام محبت: ساحر لدھیانوی (شخصیت)	اظہر جاوید	180.00
۱۶۰۔ کنز المعارف (تصوف)	صوفی مقبول شاہ قادری	150.00
۱۶۱۔ پردہ ہے ساز کا (شعری مجموعہ)	ساجدہ زیدی	150.00
۱۶۲۔ پھر سوئے حرم لے چل (سفرنامۂ حج)	سہیل انجم	100.00
۱۶۳۔ صحرائی شب و روز (ناول)	سُنیل گنگوپادھیائے (مترجم: نوتن مکھرجی، اے۔آر۔منظر)	120.00
۱۶۴۔ جاتے جاتے (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	150.00
۱۶۵۔ راستہ بند ہے (ناول)	مصطفیٰ کریم	220.00
۱۶۶۔ چاہت کے رنگ (ناول)	طاہر تنویری	250.00
۱۶۷۔ رات، شہر اور زندگی (مضامین)	شمیم حنفی	220.00
۱۶۸۔ نقوشِ جاوداں (سوانح)	ڈاکٹر شمس کمال انجم	200.00
۱۶۹۔ دکنی نثر پر ایک نظر (تنقید)	ڈاکٹر مجید بیدار	200.00
۱۷۰۔ قندِ مکرر (طنز و مزاح)	فیاض احمد فیضی	150.00
۱۷۱۔ شالملی (ناول)	ناصرہ شرما	150.00
۱۷۲۔ دُور نہیں منزل (ناول)	دلشاد امروہوی	150.00
۱۷۳۔ اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (تحقیق)	سید تنویر حسین	160.00
۱۷۴۔ سخنورانِ عہد پہلوی (تذکرہ)	ڈاکٹر غلام اشرف قادری	180.00
۱۷۵۔ گھنگھرو ٹوٹ گئے (سوانح عمری)	قتیل شفائی	440.00
۱۷۶۔ راستے کی بات (شاعری)	ارمان نجمی	180.00
۱۷۷۔ سایہ اونچے پیڑ کا (افسانے)	شکیل جاوید	150.00

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۷۸	جہانِ فکشن (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	220.00
۱۷۹	کلاسیکی شاعری کا مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر فاطمہ بیگم پروین	200.00
۱۸۰	رشتوں کی دیوار (افسانے)	اکرام الدین شبنم	140.00
۱۸۱	دہلیز سے اُترے پاؤں (افسانے)	شکیل جاوید	150.00
۱۸۲	ایک اور چکمہ (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	160.00
۱۸۳	چار دیواری (ناول)	شوکت صدیقی	500.00
۱۸۴	سیپیوں میں سمندر (شاعری)	رام اوتار گپتا مضطر	150.00
۱۸۵	اشاراتِ عقیل (مضامین)	مرتب: ڈاکٹر ہاجرہ کوثر	250.00
۱۸۶	یہ خلد بریں ارمانوں کی (شہروں کا تذکرہ)	مرتب: ڈاکٹر شکیل اختر	300.00
۱۸۷	غارِ حرا میں ایک رات (سفرنامہ)	مستنصر حسین تارڑ	300.00
۱۸۸	جائزہ انیس (تنقید)	ڈاکٹر عسکری صفدر	200.00
۱۸۹	اُردو سیکھنے کا نیا طریقہ	ڈاکٹر سید تنویر حسین	100.00
۱۹۰	جہانِ دگر (افسانے)	فیاض رفعت	300.00
۱۹۱	آنگن آنگن پُروائی (شاعری)	رفیعہ شبنم عابدی	150.00
۱۹۲	ڈوبتے سورج کی روشنی (افسانے)	رئیس نجمی امروہوی	150.00
۱۹۳	ترسیل (مکتوبات بنام اختر شاہجہاں پوری)	مرتب: مدہوش بلگرامی	150.00
۱۹۴	برگِ نو (شعری مجموعہ)	اختر شاہجہاں پوری	150.00
۱۹۵	رام دین (مضامین)	ممتاز مفتی	250.00
۱۹۶	تتلیاں ڈھونڈنے والی (افسانوی مجموعہ)	زاہدہ حنا	250.00
۱۹۷	نشیب و فراز (ناول)	بنت فاطمہ نقویہ	250.00
۱۹۸	صاعقہ (ناول)	رضیہ بٹ	250.00
۱۹۹	لیکن (شاعری)	جونؔ ایلیا	200.00
۲۰۰	گویا (شاعری)	جونؔ ایلیا	250.00
۲۰۱	پس پردہ (فلمی مضامین)	انیس امروہوی	200.00
۲۰۲	بدن کی جمالیات (مضامین)	حقانی القاسمی	180.00

ہماری آئندہ اشاعتیں

نمبر	کتاب	مصنف	کیفیت
۱	شاید یعنی گمان (شاعری)	جونؔ ایلیا	زیر طبع
۲	سمندر اجنبی ہے (افسانے)	کرامت غوری	زیر طبع

۳۔ ڈوبتے اُبھرتے جزیرے (شخصیات)	ڈاکٹر مجید بیدار	زیرِطبع
۴۔ روغنی پتلے (افسانے)	ممتاز مفتی	زیرِطبع
۵۔ چپ (افسانے)	ممتاز مفتی	زیرِطبع
۶۔ اَن کہی (افسانے)	ممتاز مفتی	زیرِطبع
۷۔ **نسیم اللّغات** (اُردو لغت)	سید قائم رضا نسیم امروہوی	زیرِطبع
۸۔ صادقین: جی سے بھلایا نہ جائے گا (سوانح)	عنبرین عباس	زیرِطبع
۹۔ بہشتِ زہرہ (ناول)	ناصرہ شرما	زیرِطبع
۱۰۔ شکستہ ستون پر دھوپ (ناول)	عطیہ حسین/ترجمہ: انتظار حسین	زیرِطبع
۱۱۔ ضمیر کی آواز (مضامین)	زاہدہ حنا	زیرِطبع
۱۲۔ سلیم اختر: خصوصی مطالعہ (شخصیت)	مرتبین: مرغوب علی، انیس امروہوی	زیرِطبع
۱۳۔ ایک اور بٹوارہ (تنقید)	مرتبین: مرغوب علی، انیس امروہوی	زیرِطبع
۱۴۔ انتخاب کلیاتِ مصحفی (شعری انتخابات)	مرتب: مرغوب علی	زیرِطبع
۱۵۔ کلیاتِ خلیل جبران (حصہ اول)	مرتب: انیس امروہوی	زیرِطبع
۱۶۔ نفسیات کے معمار (شخصیات)	سید اقبال امروہوی	زیرِطبع
۱۷۔ پازیب (فلمی اسکرپٹ)	دلشاد امروہوی	زیرِطبع
۱۸۔ ممتاز مفتی: ایک مطالعہ (شخصیت)	مرتب: انیس امروہوی	زیرِطبع
۱۹۔ دو زاویے (شعری انتخاب)	مرتب: انیس امروہوی	زیرِطبع
۲۰۔ سلسلے (مضامین)	ہرچرن چاؤلہ	زیرِطبع
۲۱۔ نجات دہندہ کی تلاش (افسانے)	وجے	زیرِطبع
۲۲۔ پال بچپاسی (افسانے)	جوگندر پال	زیرِطبع
۲۳۔ پل دو پل (افسانے)	انور عظیم	زیرِطبع
۲۴۔ ہیرامنڈی (تحقیق و تجزیہ)	زاہد عکاسی	زیرِطبع
۲۵۔ مٹھی بھر سانپ (افسانے)	ڈاکٹر سلیم اختر	زیرِطبع
۲۶۔ جذبی: ایک مطالعہ (شخصیت)	مرتب: انیس امروہوی	زیرِطبع
۲۷۔ نوشاد: ایک زندگی (شخصیت)	مرتب: انیس امروہوی	زیرِطبع
۲۸۔ رضا الجبار: فن اور شخصیت (شخصیت)	مرتب:	زیرِطبع
۲۹۔ اُردو افسانے میں علاقائی زندگی کی عکاسی (تحقیق)	ممتاز آراء	زیرِطبع
۳۰۔ آزادی کے بعد اردو مضامین میں طنز و مزاح (تحقیق)	ڈاکٹر سیادت علی	زیرِطبع

دیگر اداروں کی مطبوعات

۱۔ تاریخ امروہہ (تاریخ)	محمود احمد الہاشمی العباسی	250/-
۲۔ تاریخ گلزار آصفیہ (تاریخ)	خواجہ غلام حسین خاں	200/-
۳۔ لندن کے رات دن (افسانے)	علی باقر	300/-
۴۔ میرے نالوں کی گمشدہ آواز (ناول)	محمد علیم	400/-
۵۔ ترقی پسند ادب کے معمار (تذکرہ)	پروفیسر قمر رئیس	500/-
۶۔ اردو صحافت اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (صحافت)	معصوم مرادآبادی	100/-
۷۔ کیا ہوئے وہ لوگ (شخصیات)	معصوم مرادآبادی	80/-
۸۔ شہر میں کرفیو (ناول)	وبھوتی نارائن رائے	100/-
۹۔ فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس (تجزیہ)	وبھوتی نارائن رائے	150/-
۱۰۔ روشنائی	سجاد ظہیر	250/-
۱۱۔ مدحت کے پھول (نعت و منقبت)	حامد امروہوی	200/-
۱۲۔ جوئے بارِ بخشش (نعت و منقبت)	حامد امروہوی	200/-
۱۳۔ آرزوئے بخشش (نعت و منقبت)	ساجد امروہوی	200/-
۱۴۔ گوہر بخشش (نعت و منقبت)	ساجد امروہوی	250/-
۱۵۔ خیابانِ ارم (نعت و منقبت)	حامد امروہوی	150/-
۱۶۔ نکہتیں (نعت و منقبت)	مرزا احمد حسین سیفی امروہوی	150/-
۱۷۔ سرمایۂ رؤف امروہوی (انتخاب کلام رؤف امروہوی) مرتب: حامد امروہوی		350/-

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092

PH. 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com

حقانی القاسمی کا تعلق صوبہ بہار کے اُرریہ ضلع کے چھوٹے سے گاؤں بگڈہرہ سے ہے۔ ایک متوسط خاندان میں جناب عبدالصمد صاحب کے بیٹے حقانی القاسمی کا جنم ۲۶؍جنوری ۱۹۷۰ء کو ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی ادبیات میں ایم۔اے کرنے کے بعد دہلی کے مختلف مقبول و معتبر اخبارات سے وابستہ رہے۔ ادبی سہ ماہی ''استعارہ''، نئی دہلی سے بھی بحیثیت شریک مدیر حقانی القاسمی کا تعلق رہا۔ ''بدن کی جمالیات'' سیریز اسی مجلّہ میں شائع ہوئی تھی جس کا قارئین کو بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔

نئے موضوعاتی منطقے کی جستجو حقانی القاسمی کی ترجیحات میں شامل رہی ہے۔ وہ ہمیشہ مخالف سمتوں میں سفر کرتے ہیں اور فکر و نظر کے باب میں عمومی راہ و روش سے ان کی ڈگر الگ ہے۔ صرف اردو ادبیات ہی نہیں بلکہ عالمی ادبیات، تحریکات اور نظریات پر بھی ان کی نظر ہے۔ مشرقی علوم و ادبیات سے آگاہ حقانی القاسمی ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں اور اسلوبی سطح پر امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کی تنقید میں تخلیقیت کا رنگ گہرا ہے۔ تخلیقی تنقید پر محیط ان کی کتاب 'طوافِ دشتِ جنوں' علمی، ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں شائع کتاب ''فلسطین کے چار ممتاز شعرا''، اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی جسے عصری، عالمی حالات اور بین الاقوامی سیاسیات پر گہری نظر رکھنے والے اربابِ فکر و نظر اور اہلِ دل نے ایک دستاویزی حیثیت دی۔ 'لاتخف'، 'تکلف برطرف' (سیاسی، سماجی اور ادبی کالموں کا مجموعہ)، 'رینو کے شہر میں' اور 'خوشبو، روشنی، رنگ' ان کی دیگر مشہور کتابیں ہیں۔

— انیس امروہوی

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092

Ph : 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com